آسان عربی گرامر ویڈیو کیسٹس

انجمن خدام القرآن سندھ' کراچی کے زیر اہتمام آسان عربی گرامر حصہ اول اور حصہ دوم کی تدریس کے ویڈیو کیسٹس تیار کر لئے گئے ہیں تاکہ

۱) ایسے خواتین و حضرات جو عربی گرامر کلاس میں شرکت کے لئے وقت فارغ نہ کر سکیں' اپنے گھر پر ہی ویڈیو کے ذریعہ عربی گرامر کے بنیادی قواعد وضوابط سیکھ سکیں۔

۲) جن مقامات پر معلم دستیاب نہ ہوں وہاں ویڈیو کیسٹس کے ذریعہ عربی گرامر کے اس کورس کی کلاس منعقد کی جاسکے۔

ویڈیو ریکارڈنگ کی خصوصیات

۱) ہر عنوان کی جملہ خصوصیات کا خلاصہ نکات کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

۲) ہر مشق کے تمام عربی اور اردو جملوں کا ترجمہ کروایا گیا ہے۔

۳) ہر عنوان سے متعلق قرآن حکیم سے اضافی مثالیں شامل کی گئی ہیں۔

ویڈیو کیسٹس کی کل تعداد 14 ہے

اور ان کی قیمت' علاوہ ڈاک خرچ 2100 روپے ہے

مندرجہ ذیل پتہ سے طلب فرمائیں :

انجمن خدام القرآن سندھ' کراچی

قرآن اکیڈمی' خیابان راحت' درخشاں' فیز IV ڈیفنس کراچی

فون : 5855219-5854036 فیکس 5840009

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرة: ۲۶۹)

ماهنامہ

حکمتِ قرآن

لاھور

K-36

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۶ | ربیع الاوّل ۱۴۱۸ھ — جولائی ۱۹۹۷ء | شمارہ ۷

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاھور

۳۶- کے- ماڈل ٹاؤن- لاھور ۱۴- فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بکری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۹۵۸۶

سالانہ زرِتعاون -/۸۰ روپے، فی شمارہ -/۸ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرفِ اوّل

مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے دروس کی "حکمت قرآن" میں سلسلہ وار اشاعت بفضلہٖ تعالیٰ پابندی کے ساتھ جاری ہے۔ زیر نظر شمارے میں سورۃ التغابن کے درس کا نصف اول شائع کیا گیا ہے جو اس منتخب نصاب میں آٹھویں سبق کے طور پر شامل ہے۔ یہ سورۂ مبارکہ جو دو رکوعوں پر مشتمل ہے' ایمانیاتِ ثلاثہ کے بیان اور ایمان کے ثمرات و مضمرات کی وضاحت کے اعتبار سے قرآن حکیم کی منفرد' نہایت مؤثر اور جامع ترین صورت ہے۔

منتخب نصاب کے ضمن میں اس سے قبل قرآن حکیم کے درج ذیل مقامات کے دروس "حکمت قرآن" میں شائع کئے جا چکے ہیں: ۱) سورۃ العصر' ۲) آیۃ البر (یعنی سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۱۷۷)' ۳) سورۃ لقمان کا دوسرا رکوع' ۴) سورۃ حم السجدہ کی آیات ۳۰ تا ۳۶' ۵) سورۃ الفاتحہ' ۶) سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی ابتدائی آیات' اور ۷) سورۃ النور کا پانچواں رکوع۔ ان میں سے پہلے چار اسباق کو جامع اسباق کا عنوان دیا گیا ہے' یعنی وہ اسباق جن میں اخروی نجات و فلاح کے جملہ لوازم جامعیت کے ساتھ سموئے گئے ہیں' جبکہ بعد کے تین اسباق "ایمان" کے مباحث پر مشتمل ہیں کہ جو لوازم نجات میں اہم ترین اور مقدم ترین لازمہ کی حیثیت رکھتا ہے ـــــ قبل ازیں شائع کئے جانے والا ہر سبق قارئین کی سہولت کی خاطر مکمل حالت میں "حکمت قرآن" میں شائع کیا گیا' تاہم سورۃ التغابن کے درس کی طوالت کے پیش نظر اسے دو اقساط میں تقسیم کرنا ناگزیر تھا۔ اس درس کا نصف ثانی ان شاء اللہ العزیز اگلے پرچے میں شائع کر دیا جائے گا۔

ہم اس امر کا اہتمام بھی کر رہے ہیں کہ "حکمت قرآن" میں شائع ہونے والے ان دروس کو ساتھ کے ساتھ کتابی صورت میں بھی شائع کر دیں ـــــ قارئین کو یہ جان کر خوشی ہو گی کہ ابتدائی چار دروس (یعنی سورۃ العصر' آیۃ البر' سورۃ لقمان کا دوسرا رکوع اور سورۃ حم السجدہ کی ۷ آیات) کتابچوں کی صورت میں شائع کئے جا چکے ہیں اور مکتبہ انجمن سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

دیگر دروس بھی ان شاء اللہ بہت جلد کتابچوں کی صورت میں دستیاب ہو سکیں گے۔

اَلسَّعۡیُ مِنَّا وَالۡاِتۡمَامُ مِنَ اللّٰہِ

مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب' از : ڈاکٹر اسرار احمد

درس ۸

ایمان اور اس کے ثمرات و مضمرات

سورۃ التغابن کی روشنی میں

آج ہم اللہ کے نام سے مطالعہ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کے آٹھویں درس کا آغاز کر رہے ہیں' جو اِن صفحات میں سلسلہ وار زیر اشاعت ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل وضاحت کی جا چکی ہے کہ اس منتخب نصاب کا حصہ دوم مباحثِ ایمانی پر مشتمل ہے' اور اس حصہ دوم کا یہ چوتھا درس ہے جو سورۃ التغابن پر مشتمل ہے جو مصحف کے اٹھائیسویں پارے میں ہے اور جو دو رکوعوں اور اٹھارہ آیتوں پر مشتمل ہے۔ سورۃ العصر کے بعد یہ پہلی مکمل سورت ہے جو اس منتخب نصاب میں شامل ہے۔

سورت کے مضامین کا اجمالی تجزیہ

میرے مطالعے اور غور و فکر کی حد تک قرآن مجید کی چھوٹی سورتوں میں ایمان کے موضوع پر جامع ترین سورت سورۃ التغابن ہے۔ یہاں اس بات کو دوبارہ ذہن میں مستحضر کر لیجئے کہ ان مباحث میں ایمان سے مراد قانونی اور فقہی ایمان نہیں ہے جس کی بناء پر ہم اِس دنیا میں ایک دوسرے کو مسلمان سمجھتے ہیں' بلکہ ایمانِ حقیقی ہے جو قلبی یقین سے عبارت ہے' اور جیسے کہ ہم سورۃ النّور کی آیاتِ نور میں دیکھ چکے ہیں' وہ ایمان ایک نور ہے جس سے انسان کا باطن روشن اور منوّر ہو جاتا ہے اور جس کا اصل محل و مقام قلب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصحف میں سورۃ التغابن سے متصلاً قبل سورۃ المنافقون واقع ہے' اور منافقین کے بارے میں یہ بات سب جانتے ہیں کہ وہ بھی قانوناً مسلمان شمار ہوتے تھے اور دنیا میں ان کے ساتھ بالکل مسلمانوں کا سا سلوک ہوتا تھا' اگرچہ وہ ایمانِ حقیقی سے محروم

ہوتے تھے۔ گویا حقیقتاً کافر تھے۔ اس طرح قرآن مجید میں سورۃ المنافقون کے فوراً بعد سورۃ التغابن کو لاکر گویا تصویر کے دونوں رخوں کو یکجا کر دیا گیا' یا یوں کہہ لیجئے کہ "تُعرَفُ الاشیاءُ بأضدادِھا" کے اصول کے مطابق "کفرِ حقیقی" کے بالمقابل "ایمانِ حقیقی" کا آئینہ رکھ دیا گیا۔

جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے سورۃ التغابن کی اٹھارہ آیات ہیں جو دو رکوعوں میں منقسم ہیں۔ یہ بڑی پیاری اور دلکش تقسیم ہے۔ پہلے رکوع کی دس آیات میں سے پہلے سات آیات میں ایمانیاتِ ثلاثہ کا ذکر ہے۔ یعنی ایمان باللہ اور صفاتِ باری تعالیٰ' ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرہ یا ایمان بالمعاد۔ پھر اگلی تین آیات میں ایمان کی نہایت پرزور دعوت ہے کہ یہ واقعی حقائق ہیں' ان کو قبول کرو' ان کو تسلیم کرو' انہیں حرزِ جاں بناؤ اور ان پر یقین سے اپنے باطن کو منور کرو۔

دوسرے رکوع کی کل آٹھ آیات ہیں۔ ان میں بھی یہی تقسیم ہے کہ پہلی پانچ آیات میں ایمان کے ثمرات اور ایمان کے نتیجے میں انسان کے فکر و نظر اور اس کی شخصیت میں جو تبدیلیاں رونما ہونی چاہئیں' ان کا بیان ہے۔ یعنی (۱) تسلیم و رضا (۲) اطاعت و انقیاد (۳) توکل و اعتماد (۴) علائقِ دنیوی کی فطری محبت کے پردے میں انسان کے دین و ایمان اور آخرت و عاقبت کے لئے جو بالقوہ خطرہ مضمر ہے' اس سے متنبہ اور چوکس و چوکنا رہنا اور (۵) مال اور اولاد کی فتنہ انگیزی سے ہوشیار و باخبر رہنا ـــــ اور آخری تین آیات میں ایمان کے ان تقاضوں کو پورا کرنے کی نہایت زوردار اور مؤثر ترغیب و تشویق ہے' اور ان میں تقویٰ' سمع و طاعت اور انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ سورۂ مبارکہ واضح طور پر چار حصوں میں منقسم ہے۔

ابتدائی چار آیات :

اللہ تعالیٰ کی توحید اور صفاتِ کمال کا ذکر

اب آیئے اس سورۂ مبارکہ کے پہلے رکوع کے پہلے حصے کی جانب جو چار آیات پر مشتمل ہے۔ ان آیات پر کسی تفصیلی گفتگو سے قبل مناسب ہوگا کہ ان کا ایک رواں ترجمہ

ذہن نشین کرلیا جائے۔

﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۖ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝﴾ (التغابن : ۱-۴)

"اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ شے جو زمین میں ہے۔ (واقعہ یہ ہے کہ کل کائنات کی) بادشاہی بھی اسی کی ہے اور کُل شکر و سپاس اور تعریف و ثناء کا مستحق حقیقی بھی صرف وہی ہے۔ مزید برآں وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی جس نے تم سب کو تخلیق فرمایا لیکن تم سے کچھ (اس کا) انکار کرنے والے ہیں اور کچھ (اس کو) ماننے والے ہیں' اور جو کچھ تم (اس دنیا میں) کر رہے ہو' اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اسی نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا اور تمہاری نقشہ کشی کی اور بہت ہی اچھی نقشہ کشی کی اور صورت گری فرمائی اور (تمہیں) اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ جانتا ہے کہ جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو' اور اللہ سینوں میں پوشیدہ رازوں کا بھی جاننے والا ہے۔"

جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے' ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی صفاتِ کمال کا بیان بڑے پُر جلال انداز میں ہوا ہے۔ اس موقع پر یہ اصولی بات ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ ایمان اصلاً ایمان باللہ کا نام ہے۔ اصولی' علمی اور نظری اعتبار سے ایمان باللہ ہی ایمان کی اصل جڑ اور بنیاد ہے۔ ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت دونوں اصلاً اسی کی فروع ہیں۔ چنانچہ ایمان بالوحی' ایمان بالنبوت' ایمان بالکتب یا فی الجملہ ایمان بالرسالت اصل میں اللہ تعالیٰ کی کی صفتِ ہدایت کا مظہرِ اتم ہے۔ اسی طرح بعث بعد الموت' حشر و نشر' حساب و کتاب' جزا و سزا اور جنت و دوزخ کی تصدیق گویا فی الجملہ ایمان بالآخرت

یا ایمان بالمعاد اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل اور اس کے اسم گرامی "الحسیب" کا مظہر ہے۔ گویا اللہ حساب لینے والا ہے اور حساب کے مطابق جزا و سزا دینے والا ہے۔ اور اس کی اسی شان کا کامل ظہور آخرت میں ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ اصل ایمان 'ایمان باللہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ التغابن کے پہلے رکوع میں ایمان باللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید اور صفاتِ کمال کا بیان چار آیات میں ہوا ہے جب کہ ایمان بالرسالت اور ایمان بالمعاد دونوں کو تین آیات میں سمو دیا گیا ہے۔

ان ابتدائی چار آیات میں ایمان باللہ کا بیان نہایت معجز نما اسلوب میں غایت درجہ اختصار لیکن حد درجہ جامعیت کے ساتھ ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾

"اللہ کی تسبیح کرتی ہے ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ شے جو زمین میں ہے۔"

"تسبیح" کا معنیٰ و مفہوم

یہاں پہلے لفظ تسبیح پر غور کر لیجئے۔ اگرچہ فوری طور پر اس کے جو عام معنیٰ ذہن میں آتے ہیں وہ یہ اقرار ہے کہ اللہ پاک ہے۔ لیکن اس کا حقیقی مفہوم کیا ہے' اسے جاننا ضروری ہے۔ "سَبَحَ یَسْبَحُ" عربی میں کسی چیز کے تیرنے کو کہتے ہیں' خواہ وہ چیز پانی کی سطح پر تیر رہی ہو' خواہ فضا یا خلا میں اپنے مدار پر اپنی سطح کو برقرار رکھتے ہوئے حرکت کر رہی ہو۔ چنانچہ آپ کو قرآن مجید میں یہ الفاظ ایک سے زائد مقامات پر ملیں گے کہ : ﴿كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ "یہ تمام (اجرام سماویہ خلا میں) اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں"۔ یہ فعل لازم ہے' اس سے فعل متعدی بنے گا "تیرانا" یا کسی شے کو اس کی سطح پر برقرار رکھنا۔ یہ ہے سَبَّحَ یُسَبِّحُ۔ اس کا مصدر "تسبیح" ہے۔ گویا لفظ تسبیح کے لغوی معنی ہیں "کسی کو اس کی اصل سطح پر برقرار رکھنا"۔ چنانچہ اللہ کی تسبیح یہ ہے کہ اس کا جو مقام بلند ہے' اس کی جو اعلیٰ و ارفع شان ہے' اسے اس پر برقرار رکھا جائے' اور اس کی ذات اقدس' صفاتِ اکمل اور شانِ ارفع کے ساتھ کوئی ایسا تصور شامل نہ کیا جائے جو اس

کے شایانِ شان نہ ہو۔ گویا کسی بھی درجے کے ضعف' عجز' نقص' عیب یا محدودیت کا کوئی بھی تصور اس کی ذات وصفات کے ساتھ شامل کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اسے اس کے مقام رفیع سے نیچے گرا رہا ہے۔ معاذ اللہ! ـــــ پس تسبیح باری تعالیٰ کا مفہوم یہ ہو گا کہ اس بات کا اقرار واعتراف کیا جائے کہ اللہ ہر عیب سے' ہر نقص سے' ہر ضعف سے' ہر احتیاج سے منزّہ وماوراء اور اعلیٰ وارفع ہے "گویا فی الجملہ "اللہ پاک ہے"۔ واضح رہے کہ یہ معرفتِ الٰہی کا سلبی پہلو ہے کہ ہم نے یہ جان لیا کہ اللہ میں کوئی نقص نہیں' کوئی عیب نہیں' اسے کوئی احتیاج نہیں۔ وہ ان سب سے منزّہ اور پاک ہے۔ معرفتِ الٰہی کے مثبت پہلو کا بیان "وَلَهُ الْحَمْدُ" کے الفاظ میں آئے گا جو آگے آ رہے ہیں!

اب قابل غور امر یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے کس معنیٰ ومفہوم میں اللہ کی تسبیح کر رہی ہے! تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو کوئی زبان دی ہو۔ جیسے کہ ہم جانتے ہیں کہ پرندوں کی بھی زبان ہے اور ان کی اپنی بولیاں ہیں۔ اسی طرح شجر و حجر میں بھی حس موجود ہے اور کوئی عجب نہیں کہ وہ بھی آپس میں مبادلۂ احساس کرتے ہوں۔ چیونٹی جیسی حقیر مخلوق کی گفتگو کا ذکر سورۃ النمل میں موجود ہے : ﴿قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ﴾ "ملکہ چیونٹی نے کہا کہ اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ"۔ لہٰذا یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو کوئی زبان عطا کی ہو' کیونکہ قرآن مجید میں ایک مقام پر یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں : ﴿اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ "(قیامت میں انسان کے اعضاء کہیں گے کہ) اس اللہ نے ہمیں بھی گویائی عطا فرما دی ہے جس نے ہر شے کو گویائی بخشی"۔ یعنی میدانِ حشر میں انسان کے اعضاء جب اس کے خلاف گواہی دیں گے تو انسان پکار اٹھے گا کہ تم ہمارے جسم کا حصہ ہوتے ہوئے ہمارے خلاف گواہی کیوں دے رہے ہو؟ تو وہ جواب میں مذکورہ بالا بات کہیں گے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ کائنات کی ہر شے جو تسبیح لسانی کر رہی ہے وہ ہمارے فہم سے ماوراء ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد فرمایا :

﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ

تَسۡبِيۡحَهُمۡ ﴾ (آیت ۴۴)

"اس (اللہ) کی تسبیح تو ساتوں آسمان اور زمین اور وہ ساری چیزیں کر رہی ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ کوئی شے ایسی نہیں ہے جو اس کی تحمید کے ساتھ تسبیح نہ کر رہی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے۔"

البتہ اس کائناتی اور آفاقی تسبیح کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جو ہماری سمجھ میں آتا ہے جسے تسبیحِ حالی قرار دینا مناسب ہو گا۔ یعنی یہ کہ ہر شے اپنے وجود سے اعلان کر رہی ہے گویا زبانِ حال سے اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ میرا خالق' میرا مالک' میرا صانع' میرا مصوّر' میرا موجد' اور میرا مدبّر ایک ایسی ہستی کامل ہے جس کے نہ علم میں کوئی کمی ہے' نہ قدرت میں کوئی کمی ہے اور نہ حکمت میں کوئی کمی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اگر کوئی تصویر نہایت اعلیٰ ہے' فنِ مصوری کا شہ پارہ ہے تو درحقیقت وہ تصویر اپنے وجود سے اپنے مصور کے کمالِ فن کو ظاہر کرتی ہے۔ تخلیق اگر کامل ہے تو اس سے اس کے خالق کا کمال ظاہر ہو رہا ہے۔ لہٰذا یہ کُل کائنات' یہ جملہ مصنوعات اور یہ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق کے حد درجہ اکمل و اَتم اور صفتِ "تصویر" یعنی صورت گری کے نہایت حسین و جمیل مظاہر ہیں۔ سورۃ الحشر کی آخری تین آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کے سولہ (۱۶) اسمائے حسنیٰ آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کا ایسا حسین اور اتنا عظیم گلدستہ کسی اور مقام پر نہیں آیا ہے۔ ان سولہ اسمائے حسنیٰ میں سے تین الخالق' الباری اور المصور ہیں۔ یعنی اللہ تخلیق کی منصوبہ بندی فرمانے والا ہے' اس کو خارج میں ظاہر فرمانے والا ہے' اور اس کی آخری صورت گری اور نقشہ کشی کرنے والا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کل کائنات اور کل موجودات کا الخالق' الباری اور المصور اللہ سبحانہ کی ذاتِ اقدس ہے۔ اور یہ تخلیق و تصویر کامل ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الملک میں چیلنج کے انداز میں ارشاد فرمایا:

﴿ مَا تَرٰى فِىۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ هَلۡ تَرٰى مِنۡ فُطُوۡرٍ ۝ ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ كَرَّتَيۡنِ يَنۡقَلِبۡ اِلَيۡكَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيۡرٌ ۝ ﴾ (آیت ۳' ۴)

"تم رحمٰن کی تخلیق میں کوئی نقص تلاش نہ کر سکو گے۔ ذرا چاروں طرف نظر دوڑاؤ' کیا تمہیں کہیں کوئی رخنہ نظر آتا ہے؟ ذرا دوبارہ دیکھو اور بار بار دیکھو' لیکن تمہاری نگاہیں تھک ہار کر لوٹ آئیں گی (اور تم ہماری اس تخلیق میں کوئی نقص و عیب نہ نکال سکو گے)۔"

تو سوچو کہ عیب و نقص سے مبرّا و منزّہ کون ہے؟ وہ ہستی کہ جس نے ان سب کی تخلیق فرمائی اور جو اس پوری کائنات کی خالق و مصور بھی ہے اور محافظ و مدبّر بھی! الغرض یہ ہیں معانی و مفاہیم "یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ" کے!

"لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ" کا مفہوم

اسی آیت مبارکہ میں آگے ارشاد فرمایا ﴿لَہُ الْمُلْکُ﴾ "بادشاہی اسی کی ہے"۔ یعنی اس پوری کائنات کا حقیقی حکمران وہی ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری!

گویا وہ قانوناً (de jure) بھی اس پوری کائنات کا بلا شرکتِ غیرے بادشاہ ہے۔ یعنی حکمرانی کا استحقاق بھی صرف اسی کو حاصل ہے اور واقعتاً (de facto) بھی بادشاہی اسی کی ہے۔ یعنی فی الواقع بھی بادشاہ حقیقی اور حاکمِ مطلق صرف اسی کی ذات ہے۔ گویا "لَہٗ" میں حرفِ جار "لام" لامِ استحقاق کے معنی بھی دے رہا ہے اور لامِ تملیک کے بھی۔ اگر صحیح نہج پر غور کیا جائے تو اس لازمی نتیجے تک پہنچے بغیر چارہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن مخلوقات کو کچھ اختیار بخشا ہے' جیسے جن و انس' ان کا اپنا پورا وجود بھی اللہ کے قانون میں جکڑ ہوا ہے۔ چنانچہ ہم اس بات پر بھی قادر نہیں ہیں کہ اپنے جسم کے کسی حصے پر بالوں کی روئیدگی کو روک سکیں۔ ہمیں یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ جب چاہیں اپنے قلب کی حرکت کو روک دیں اور جب چاہیں اسے رواں کر دیں۔ اسی طرح ہم آنکھ سے سننے کا کام نہیں لے سکتے اور کان سے دیکھنے کا کام نہیں لے سکتے۔ معلوم ہوا کہ ہمارا اپنا وجود بھی ہمارے حکم کے تابع نہیں ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ کے قوانینِ تکوینی و طبعی میں جکڑا ہوا ہے۔ گویا وہ بھی اسی بادشاہِ حقیقی کا حکم مان رہا ہے' جس کے لئے نہایت ایجاز و اعجاز کے ساتھ فرمایا گیا ہے "لَہٗ

اَلۡمُلۡکُ " یعنی "حقیقی بادشاہی صرف اسی کی ہے"۔ یہ دوسری بات ہے کہ اپنے وجود کے ایک نہایت محدود اور حقیر سے حصے میں اختیار اور ارادے کی اس آزادی پر' جو تمام تر اللہ ہی کی عطاکردہ ہے' ہم اتنے از خود رفتہ ہو جائیں کہ اردو ضرب المثل کے مطابق ہلدی کی گانٹھ پاکر پنساری بن بیٹھیں اور اپنے آپ کو کلیتاً خود مختار سمجھنے لگیں!

آگے چلئے۔ ارشاد فرمایا ﴿وَلَہُ الۡحَمۡدُ﴾ "اور کل حمد بھی اسی کے لئے ہے"۔ لفظ "حمد" (جس کی تشریح اس سے قبل سورۃ الفاتحہ کے درس میں بیان ہو چکی ہے) مجموعہ ہے شکر و ثناء دونوں کا۔ گویا کل شکر اسی کے لئے ہے اور کل ثناء بھی اسی کے لئے ہے۔ اس لئے کہ اس پورے سلسلۂ کون و مکاں میں جہاں کہیں کوئی خیر و خوبی' کوئی حسن و جمال اور کوئی مظہرِ کمال نظر آ رہا ہے اس کا سرچشمہ و منبع اللہ تعالیٰ ہی کی ذاتِ والاصفات ہے۔ لہٰذا تعریف کا حقیقی مستوجب و سزاوار اور مالک و مستحق بھی صرف وہی ہے۔ اسی طرح چونکہ ہمیں جو کچھ بھی حاصل ہو رہا ہے اور ہماری جو ضرورت بھی پوری ہو رہی ہے وہ چاہے بہت ہی طویل سلسلۂ اسباب کے تعلق و توسط سے ہو رہی ہو' لیکن اصل مسبب الاسباب تو بہر حال اللہ تعالیٰ ہی ہے' لہٰذا شکر کا حقیقی مستحق بھی صرف اسی کی ذات ہے۔

اللہ کی قدرتِ کاملہ کا تصور

آگے ارشاد فرمایا : ﴿وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ۝﴾ "اور وہ ہر چیز پر قادر ہے"۔ گویا اس کے قبضہ قدرت اور اختیار و اقتدار سے کوئی چیز باہر نہیں ہے! یہاں پہلی آیت ختم ہوئی۔ یاد ہو گا کہ اس سے قبل ایک درس میں عرض کیا جا چکا ہے کہ معرفتِ الٰہی کے ضمن میں جہاں تک ذاتِ باری تعالیٰ کا تعلق ہے تو وہ ہمارے فہم و ادراک ہی نہیں' ہماری قوتِ متخیلہ سے بھی وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔ چنانچہ ہمارا اللہ تعالیٰ کو جاننا اور پہچاننا کل کا کل اس کی صفات کے حوالے سے ہے۔ اور ان کے ضمن میں بھی فہم و شعور کا دائرہ بہت ہی محدود ہے۔ یعنی ہم یہ تو جانتے ہیں کہ اللہ سمیع ہے' بصیر ہے اور کلام فرماتا ہے' لیکن یہ نہیں جان سکتے کہ وہ کیسے سنتا ہے' کیسے دیکھتا ہے اور کیسے کلام کرتا ہے۔ اسی طرح ہم یہ تو جانتے ہیں کہ وہ علیم ہے' قدیر ہے اور حکیم ہے' لیکن اس کا کوئی تصور تک

نہیں کرسکتے کہ وہ کتنا علیم ہے' کتنا قدیر ہے اور کس قدر حکیم ہے۔ گویا صفاتِ باری تعالیٰ کے یہ مختلف پہلو بھی ہمارے ذہن و شعور اور فہم و ادراک سے ماوراء ہیں' اور ہمارے ذہن کے چھوٹے سے سانچے میں' جو نہایت محدود ہے' اللہ تبارک و تعالیٰ کی صفاتِ مطلقہ اپنی پوری شان کے ساتھ سما ہی نہیں سکتیں۔ لہٰذا ہمارے لئے واحد پناہ گاہ ایک لفظ "کُل" ہے۔ جیسے "هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ" (وہ ہر چیز پر قادر ہے) جس پر یہ پہلی آیتِ مبارکہ ختم ہو رہی ہے' اور "وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ" (اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے) جس پر اس سورۂ مبارکہ کا پہلا رکوع ختم ہوتا ہے! ـــــ ہر صاحبِ ذوق اندازہ کرسکتا ہے کہ ان دونوں تمامات پر اصل زور لفظ "کُلّ" پر ہے!

ایمان و کفر کی بحث

دوسری آیت کے آغاز میں فرمایا : ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ﴾ "وہ (اللہ) ہی ہے جس نے تم سب کو پیدا فرمایا"۔ گویا پہلی آیت ایک پُر جلال تمہید کی حیثیت رکھتی ہے جس کے بعد ایمان اور کفر کی بحث شروع ہو رہی ہے جس کے لئے نہایت فصیح و بلیغ اور حد درجہ لطیف پیرایۂ بیان اختیار فرمایا کہ ذرا غور کرو کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذاتِ والا صفات ہے جو تم سب کی خالق ہے۔ گوروں کو بھی اسی نے پیدا کیا اور کالوں کو بھی' مشرق کے رہنے والوں کو بھی اور مغرب کے رہنے والوں کو بھی ـــــ تو پھر کتنی حیرت کی بات ہے کہ :

﴿فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ﴾ "تو تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن!" حالانکہ اس نے ارادے اور اختیار کی جو تھوڑی سی آزادی تمہیں عطائی فرمائی ہے وہ اصلاً ابتلاء و آزمائش اور امتحان کے لئے ہے۔ جیسا کہ سورۃ الملک میں ارشاد ہوا :

﴿الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾

"اللہ ہی ہے جس نے موت و حیات کے سلسلے کو پیدا فرمایا تاکہ تم لوگوں کو آزمائے کہ کون ہے تم میں سے بہتر عمل کرنے والا"۔ یہی بات سورۃ الدھر میں اس اسلوب سے ارشاد ہوئی : ﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾ "ہم نے اس (انسان) کو (ہدایت کا) راستہ دکھادیا' اب وہ (مختار ہے) خواہ شکرگزار بندہ بنے' خواہ ناشکرا

اور انکار کرنے والا بن جائے!" ـــــ اسی اختیار کا ظہور اس طرح ہو رہا ہے کہ کچھ لوگ اس کا کفر کرنے والے ہیں اور کچھ لوگ اس کو ماننے والے ہیں' لیکن ظاہر بات ہے کہ انسان کا رویّہ اور اس کی روش بے نتیجہ نہیں رہے گی' بلکہ اس کا بھلا یا برا نتیجہ نکل کر رہے گا۔ لہٰذا اس آیت کے اختتام پر انسان کو مطلع اور خبردار کر دیا گیا کہ : ﴿وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ۝﴾ "اور جو کچھ تم کر رہے ہو' اسے اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے" ـــــ اس ارشاد میں بیک وقت ایک دھمکی بھی مضمر ہے اور ایک بشارت بھی۔ یعنی جو لوگ اس کے منکر' باغی اور سرکش ہوں گے' گویا ناشکرے ہوں گے' اور جو اس کے ساتھ شرک کریں گے' ان کو وہ سزا دے گا۔ یہ ان الفاظِ مبارکہ کا دھمکی والا پہلو ہے' اور بشارت والا پہلو یہ ہے کہ جو اس کے شکر گزار ہوں گے' اس کے مطیع و فرماں بردار ہوں گے اور اس کی معرفت سے اپنے قلوب و اذہان کو منوّر کریں گے' ان کو وہ انعام و اکرام سے نوازے گا۔ اس لئے کہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور سب کی روش سے آگاہ ہے!

کائنات اور انسان کی بامقصد تخلیق

اگلی آیت میں ارشاد فرمایا : ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ﴾ یعنی اللہ نے یہ آسمان اور یہ زمین جو پیدا فرمائے ہیں تو بیکار و بے مقصد اور بلا غرض و غایت پیدا نہیں فرمائے بلکہ "بِالحق" پیدا فرمائے ہیں۔ یعنی ایک مقصد کے ساتھ ان کی تخلیق فرمائی ہے۔ "حق" عربی زبان کا بڑا وسیع المفہوم لفظ ہے۔ اس کا اصل مفہوم ہے "وہ چیز جو فی الواقع موجود ہو"۔ باطل کا لفظ حق کی ضد ہے' چنانچہ باطل اصلاً اس کو کہتے ہیں کہ جو نظر تو آئے' محسوس و مشہود تو ہو' لیکن حقیقتاً موجود نہ ہو' جیسے سراب۔ لیکن حق کے اس مفہومِ اصلی پر چند مفاہیم زائد ہیں۔ مثلاً حق ہر وہ چیز ہے جو عقلاً مسلّم ہو' اس کے مقابلہ میں باطل وہ چیز ہے جو عقلاً مسلّم نہ ہو۔ اسی طرح حق ہر وہ شے ہے جو اخلاقاً ثابت ہو اور اس کے مقابلہ میں باطل وہ ہے جو اخلاقاً ثابت نہ ہو۔ مزید برآں حق ہر وہ چیز ہے جو بامقصد ہو' جس کے پیچھے کوئی حکمت کار فرما ہو اور اس کے مقابلہ میں باطل و عبث ہر وہ فعل ہے جو بے مقصد ہو اور جس کی پشت پر کوئی حکمت نہ ہو۔ اس آیت میں لفظ حق اسی آخری مفہوم میں

استعمال ہوا ہے اور کلام کا حاصل اور مدعا یہ ہے کہ اللہ نے یہ کائنات بے مقصد اور بغیر حکمت کے گویا باطل اور عبث نہیں بنائی۔ یہ مضمون سورۂ آل عمران کے آخری رکوع میں بھی بایں الفاظ آچکا ہے : ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾ "اے رب ہمارے' تو نے یہ سب کچھ باطل و بے مقصد نہیں بنایا!"

کائنات کی عمومی تخلیق کے ذکر کے بعد خاص طور پر تخلیق انسانی کا ذکر فرمایا گیا :

﴿وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ﴾ "اور (اس نے) تمہاری نقشہ کشی کی اور بہت ہی اچھی نقشہ کشی اور صورت گری فرمائی"۔ یعنی ذرا اپنی عظمت کو پہچانو' تم اس کل سلسلۂ تخلیق کا نقطۂ عروج ہو' اللہ نے تمہیں اشرف المخلوقات بنایا اور تمہیں کیسی کیسی عمدہ و اعلیٰ اور ظاہری و باطنی استعدادات سے نوازا۔ اس نے تمہاری تخلیق "فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ" یعنی "نہایت اعلیٰ اور بہترین انداز" پر کی۔ پھر تمہاری صورت گری کی اور ناک نقشہ عطا فرمایا اور کیا ہی عمدہ شکل و صورت سے نوازا۔ تو کیا یہ سب کچھ بے کار اور بے مقصد ہے اور "نشستند' گفتند و برخاستند" کے مانند تمہارا اس دنیا میں پیدا ہونا' حیوانوں کی طرح پیٹ اور جنس کے تقاضے پورے کرتے رہنا اور مرجانا' بس یہی تمہاری کل حقیقت ہے؟ نہیں' ایسا نہیں ہے' بلکہ : ﴿وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ﴾ "اور اسی کی طرف (سب کو) لوٹنا ہے" ـــــ اور ظاہر ہے کہ لوٹنا جواب دہی کے لئے ہوگا۔ وہاں تمہارا محاسبہ ہوگا۔ تم محض حیوان نہیں ہو' تمہارا مرتبہ و مقام بہت بلند ہے' تم اشرف المخلوقات ہو۔ لہٰذا ع

"جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے!"

کے مصداق تمہاری ذمہ داری بھی بہت زیادہ ہے اور تمہیں لازماً جواب دہی کرنی ہوگی۔ یہاں آپ نے دیکھا کہ مضمون تدریجاً ایمان باللہ سے ایمان بالآخرۃ کی طرف منتقل ہوگیا۔ قرآن حکیم میں اس مضمون کی دوسری نہایت حسین نظیر سورۃ المومنون کے آخر میں ہے کہ : ﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ﴾ "کیا تم نے یہ گمان کیا ہے کہ ہم نے تمہیں "عبث" پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤ گے"

صفتِ علم کے تین اَبعاد

چوتھی آیت میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال کے ضمن میں صفتِ علم کا ذکر ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی جن دو صفات پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے' وہ صفتِ قدرت اور صفتِ علم ہیں۔ چنانچہ "وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" اور "وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" کے الفاظ قرآن حکیم میں بتکرار و اعادہ وارد ہوئے ہیں۔ ان میں سے صفتِ علم کے بیان میں سورۃ التغابن کی یہ چوتھی آیت اس اعتبار سے بڑی منفرد ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کو تین مختلف اسالیب سے بیان کیا گیا ہے' یا یوں کہہ لیجئے کہ ہماری تفہیم کے لئے اس مقام پر اللہ کے علم کے تین ابعاد (dimensions) کو نمایاں کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ "وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے"۔ اب آپ غور کیجئے کہ بات مکمل ہو گئی' اس لئے کہ "آسمانوں اور زمین" سے مراد کُل کائنات ہے اور اس کے علم میں ہر شے کا علم شامل ہے' لیکن اس پر مزید اضافہ فرمایا: ﴿وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ﴾ "اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو یا چھپا کر کرتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو یا اعلانیہ کرتے ہو"۔ یہ ایک دوسرے رخ سے اللہ کے احاطۂ علمی کا بیان ہو گیا۔ لیکن پھر مزید تاکید اور زور کے لئے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ "اور جو کچھ تمہارے سینوں میں مخفی ہے (اور تمہارے تحت الشعور میں مضمر ہے وہ سب بھی اللہ تعالیٰ پر عیاں ہے اور) اللہ اس کا بھی جاننے والا ہے"۔ ان الفاظِ مبارکہ میں اللہ کے احاطۂ علمی کے ایک تیسرے عرض کی جانب اشارہ ہے' اس لئے کہ بعض چیزیں تو وہ ہوتی ہیں جنہیں انسان جان بوجھ کر گویا شعوری ارادے کے ساتھ چھپاتا ہے' ان کا ذکر تو آیت کے دوسرے حصے میں ہو گیا اور بعض چیزیں وہ ہیں جو انسان کے تحت الشعور میں مؤثر اور محرک عوامل کی حیثیت سے کارفرما ہوتی ہیں' اگرچہ انسان کو خود ان کا شعور نہیں ہوتا ـــــ آیت کے تیسرے اور آخری حصے میں ان کا بھی احاطہ کر لیا گیا کہ تمہارے وہ اصل محرکاتِ عمل جن کا خود تمہیں شعور حاصل نہیں ہوتا' اللہ ان سے بھی باخبر ہے' اور یہ سب اصلاً شرح ہے "وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ

عَلِیْمٌ "کی!

اس چوتھی آیت پر اللہ تعالیٰ کی توحید اور صفاتِ کمال کا بیان ختم ہوتا ہے۔

آغازِ درس میں اس سورۂ مبارکہ کا ایک تجزیہ پیش کیا جا چکا ہے کہ اس کی پہلی سات آیات میں ایمانیاتِ ثلاثہ یعنی ایمان باللہ 'ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت کا ذکر ہے اور اس کے بعد تین آیات میں ایمان کی پُرزور دعوت ہے۔ پہلے رکوع کی ان دس آیات میں سے چار آیات کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں اور اب ہم بقیہ چھ آیات کا مطالعہ کریں گے۔ لہٰذا آیئے کہ پہلے ہم ان کا سلیس و رواں ترجمہ ذہن نشین کر لیں۔

﴿اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِھِمْ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ ذٰلِکَ بِاَنَّہٗ کَانَتْ تَّاْتِیْھِمْ رُسُلُھُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ یَّھْدُوْنَنَا فَکَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَی اللّٰہُ وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۝ زَعَمَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ یُّبْعَثُوْا قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ وَذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ ۝ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝ یَوْمَ یَجْمَعُکُمْ لِیَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِکَ یَوْمُ التَّغَابُنِ وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا یُّکَفِّرْ عَنْہُ سَیِّاٰتِہٖ وَیُدْخِلْہُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خَالِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ خَالِدِیْنَ فِیْھَا وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۝﴾

(التغابن : ۵-۱۰)

"کیا نہیں پہنچ چکی ہیں تمہیں خبریں ان کی جنہوں نے کفر کی روش اختیار کی تھی (تم سے) پہلے! تو وہ چکھ چکے اپنے کئے کی سزا اور ان کے لئے (آخرت کا) دردناک عذاب مزید ہے۔ یہ اس لئے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح اور روشن تعلیمات کے ساتھ آتے رہے تو انہوں نے کہا کہ کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے؟

پس انہوں نے کفر کیا اور پیٹھ موڑلی تو اللہ نے بھی استغناء اختیار فرمایا' اور اللہ تو ہے ہی غنی اور (اپنی ذات میں از خود) محمود۔ کافروں کو یہ مغالطہ لاحق ہو گیا ہے کہ انہیں (موت کے بعد) اٹھایا نہ جائے گا۔ (اے نبی ﷺ !) کہہ دیجئے : کیوں نہیں! اور مجھے میرے رب کی قسم ہے کہ تمہیں لازماً اٹھایا جائے گا اور پھر تم کو جتلایا جائے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔ اور یہ چیز اللہ پر بہت آسان ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل فرمایا (یعنی قرآن مجید) اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ جس دن وہ تم کو جمع کرے گا جمع ہونے کے دن (یعنی قیامت کے دن) وہ ہو گا (اصل) ہار اور جیت کے فیصلہ کا دن۔ تو جو ایمان لائے گا اللہ پر اور نیک عمل کرے گا تو وہ اس سے اس کی برائیوں کو دور کر دے گا اور اسے داخل کرے گا ان باغات میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ اس میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔ یہی ہے بہت بڑی کامیابی۔ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہو گا اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہو گا وہ ہوں گے آگ والے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔"

آیاتِ مبارکہ اور ان کے ترجمہ سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ یہاں اولاً ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت کا بیان نہایت ہی مؤثر اسلوب اور حد درجہ فصاحت و بلاغت سے ہوا ہے۔ اس اندازِ کلام کے اعجاز سے ہر وہ شخص لطف لے سکتا ہے جو عربی زبان کی تھوڑی سی شُدبُد بھی رکھتا ہو۔

دو آیات میں ایمان بالرّسالت کا بیان

پہلے ایمان بالرسالت کے ضمن میں یہ عظیم حقیقت واضح کی جا رہی ہے کہ رسولؐ کا معاملہ عام واعظین یا ناصحین یا مصلحین یا مبلغین کا سا نہیں ہے کہ چاہے لوگ ان کی بات مانیں چاہے نہ مانیں کوئی اہم فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس رسول تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری حجت بن کر آتے ہیں۔ لہٰذا ان کے انکار' ان سے اعراض اور ان کی تکذیب کے دو نتیجے نکل کر رہتے ہیں اور ان کا انکار کرنے والوں کو دو سزائیں مل کر رہتی ہیں۔ ایک اس دنیا میں عذابِ استیصال جس کے ذریعے پوری پوری قومیں ہلاک و برباد کر دی گئیں' جیسے

قومِ نوحؑ' قومِ ہودؑ' قومِ صالحؑ' قومِ لوطؑ' قومِ شعیبؑ اور آلِ فرعون۔ ان قوموں کا ذکر قرآن مجید میں بار بار اسی اعتبار سے آیا ہے کہ ان کے پاس اللہ کے رسول ایسی واضح تعلیمات کے ساتھ آئے جو فطرتِ انسانی کے لئے جانی پہچانی تھیں۔ مزید برآں یہ رسول کھلے کھلے معجزات بھی لے کر آئے۔ "بیّنات" میں دونوں چیزیں یعنی واضح تعلیمات اور روشن معجزات شامل ہیں۔ لیکن جب ان قوموں نے ان رسولوں کا انکار کیا اور ان کی دعوت کو رد کر دیا تو وہ نسیاً منسیّا کر دی گئیں۔ جیسے کہ قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا کہ ﴿كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا﴾ یعنی "وہ قومیں ایسے ہو گئیں جیسے کبھی دنیا میں تھیں ہی نہیں"۔ یہ وہ سزا ہے جو رسولوں کے انکار پر اس دنیا میں ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ابھی ایک دوسری سزا باقی ہے اور وہ ہے آخرت کی سزا' یعنی جہنم! یہ مختصر سی تشریح و توضیح ہے اس آیت مبارکہ کی :

﴿اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝﴾

"کیا نہیں پہنچ چکی ہیں تمہیں خبریں ان کی جنہوں نے کفر کیا تھا پہلے! تو وہ اپنے کرتوتوں کی سزا کا ایک مزا (اس دنیا میں) چکھ چکے' اور ان کے لئے (آخرت میں دوسری سزا کے طور پر) دردناک عذاب تیار ہے"۔

اس جگہ "استفہامِ تقریری" کا اسلوب اس لئے اختیار کیا گیا کہ سورۂ تغابن مدنی سورت ہے۔ گویا قرآن مجید کا لگ بھگ دو تہائی حصہ جو مکی سورتوں پر مشتمل ہے اس سے بہت پہلے نازل ہو چکا تھا جس میں ان اقوام کا ذکر بارہا آ چکا تھا جو رسولوں کی دعوت کو رد کرنے کے جرم کی پاداش میں ہلاک کر دی گئی تھیں۔

رسالت کے ضمن میں اگلی آیت میں جو دوسری نہایت اہم بات بیان ہوئی وہ یہ ہے کہ رسولوں کے باب میں لوگوں نے جو سب سے بڑی ٹھوکر کھائی اور ان کو ماننے اور ان پر ایمان لانے میں جو سب سے بڑی رکاوٹ ان کے سامنے آ گئی وہ ان رسولوں کی بشریت تھی۔ ظاہر ہے کہ رسول انسان تھے' انسانوں کی طرح کھاتے پیتے تھے۔ وہ نبوت و رسالت پر فائز ہونے سے قبل دنیا میں کاروبار کرتے تھے' بازاروں میں چلتے پھرتے تھے' ان کو بھی وہ

احتیاجیں لاحق ہوتی تھیں جو دوسرے تمام انسانوں کو لاحق ہوتی ہیں۔ جیسے خود حضور ﷺ نے مکہ میں چالیس برس کی عمر شریف تک کاروبار کیا ہے۔ چنانچہ مشرکین مکہ نبی اکرم ﷺ پر اجرائے وحی اور ظہورِ نبوت کے بعد اسی نوع کے اعتراضات وارد کیا کرتے تھے جن کا قرآن مجید میں مختلف اسالیب سے متعدد مقامات پر ذکر ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ نے مشرکینِ مکّہ کا یہ قول نقل فرمایا ہے : ﴿وَقَالُوا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ﴾ "اور (یہ مشرکین) کہنے لگے کہ اس رسول کی کیا کیفیت ہے کہ کھاتا ہے کھانا اور چلتا پھرتا ہے بازاروں میں۔" لہٰذا ہمیشہ یہی ہوا کہ رسولوں کی بشریت ان پر ایمان لانے میں بہت بڑی رکاوٹ بنتی رہی کہ یہ تو ہم جیسے انسان ہیں۔ ہماری ہی طرح کے ہاتھ پاؤں ان کے بھی ہیں اور ہماری ہی طرح کی ضروریات و حوائج ان کو بھی لاحق ہیں۔ پھر یہ کیسے ہماری ہدایت پر مامور ہو سکتے ہیں؟ چنانچہ یہ ہے وہ سب سے بڑی ٹھوکر جو لوگوں نے نبوت و رسالت کے باب میں کھائی اور یہ ہے وہ سب سے بڑا حجاب جو رسالت کے باب میں لوگوں کے سامنے آیا' جسے کفر کے سرداروں اور وقت کے بڑے بڑے چودھریوں نے جن کی سیادت و قیادت کو رسول کی دعوتِ توحید سے خطرہ لاحق ہوتا تھا' لوگوں کو ورغلانے کا ذریعہ بنایا۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ تم اپنے ہی جیسے انسان کو رسول مان کر ان کا اتباع کرو گے تو بڑے گھاٹے میں رہو گے۔ چنانچہ انہوں نے خود بھی رسولوں کی تصدیق سے انکار کیا اور عامۃ الناس کو بھی اس سے باز رکھا ـــــ اسی حقیقت کا ذکر ہے اگلی آیت مبارکہ میں کہ رسولوں کی دعوت سے انکار کا ایک اہم سبب ان کا انسان ہونا بھی رہا ہے' ارشاد ہوتا ہے :

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝﴾

"یہ اس لئے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح اور روشن تعلیمات اور معجزات کے ساتھ آتے رہے تو انہوں نے کہا کہ کیا بشر ہمیں ہدایت دیں گے؟ پس انہوں نے کفر کیا اور پیٹھ موڑلی تو اللہ نے بھی استغناء اختیار فرمایا' اور اللہ تو ہے ہی

غنی اور اپنی ذات میں خود محمود اور ستودہ صفات"۔

یہاں آیت کے آخری الفاظ میں سمجھانے کا بڑا ہی پیارا انداز ہے۔ یعنی اللہ بے نیاز ہے' اس کو کسی کی احتیاج نہیں۔ کوئی اسے مان لے تو اس کی بادشاہی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور کوئی انکار کردے تو اس کی جلالتِ شان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ یہ تو اس کا کرم اور فضل' اور اس کی عنایت و رحمت ہے کہ اس نے انسانوں کی ہدایت کے لئے ان ہی میں سے رسول مبعوث فرمائے جنہیں اپنی ہدایتِ کاملہ سے سرفراز فرمایا اور جن پر اپنی کتاب نازل کی۔ اب اگر کوئی ناقدری کرے اور انکار و اعراض کی روش اختیار کرے تو اس سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا' اس لئے کہ ان سے اللہ کی کوئی غرض وابستہ نہیں ہے۔ البتہ اس کا فوری نقصان اور خسارہ ان ناشکروں اور نافرمانوں کو یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی نظرِ عنایت اور نگاہِ التفات کا رخ ان کی جانب سے پھیر لیتا ہے اور اپنی شان بے نیازی کا اظہار فرماتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بے نیازی کا جامہ تو صرف اسی کی ذات پر راست آتا ہے' اس لئے کہ وہ "الغنی" بھی ہے اور "الحمید" بھی!

رسالت کے ضمن میں ایک گمراہی کے دو مختلف مظاہر

یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ رسالت کے باب میں ایک گمراہی کا ظہور تو اس طرح ہوتا ہے کہ لوگ رسول کی رسالت کو اس دلیل سے رد کردیتے ہیں کہ یہ تو ہمارے ہی جیسا انسان ہے۔ گویا رسول کی بشریت قبول حق میں مانع ہو جاتی ہے' جس کا مفصل ذکر اس آیت میں آگیا۔ لیکن یہ معاملہ یہیں پر نہیں ختم ہو جاتا بلکہ اسی مرض کا ظہور رسولوں کی امتوں میں بعد میں ایک دوسری شکل میں ہوتا ہے اور وہ یہ کہ بہت سے لوگ محبت اور عقیدت کے غلو کے باعث نبیوں اور رسولوں کی بشریت کا انکار کردیتے ہیں۔ گویا بنیادی طور پر مرض وہی ہے کہ بشریت اور نبوت و رسالت میں لوگوں نے بُعد اور تضاد محسوس کیا اور اس سبب سے ایک جانب منکروں اور کافروں نے رسول کی بشریت کی بنیاد پر اس کی رسالت کی نفی کردی اور اس کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور دوسری جانب غالی امتیوں نے رسولوں کی رسالت کی بنیاد پر ان کی بشریت کا انکار کردیا۔ یہاں تک کہ بعض

انبیاء ورُسل کو خدا کا بیٹا قرار دے کر الوہیت میں شریک کر دیا گیا۔ جیسے یہود کے ایک گروہ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا اور پال کے متبعین نے تو حد ہی کر دی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا صُلبی بیٹا قرار دے کر مستقل تثلیث ایجاد کر لی۔ گویا ذہنی مرض اور گمراہی ایک ہی ہے۔ البتہ اس کے ظہور کی شکلیں مختلف ہیں۔ یعنی رسولوں کی موجودگی میں بشریت کی بنیاد پر رسالت کا انکار اور بعد میں رسالت کی بنیاد پر بشریت کا انکار!

وقوعِ قیامت کا پُرزور اثبات

اس کے بعد ایمان بالآخرۃ یا ایمان بالمعاد کا بیان شروع ہوتا ہے' اور ساتویں آیت اسی مضمون پر مشتمل ہے۔ ایمان بالآخرۃ کی عقلی اور منطقی اساس تو ایمان باللہ کے ضمن میں تیسری آیت کے آخر ہی میں "وَاِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ" کے الفاظِ مبارکہ میں قائم کر دی گئی تھی۔ اب یہاں بڑی فصاحت و بلاغت اور بڑے شدّومد کے ساتھ ایک آیت میں اس کے انکار کی پرزور نفی اور اس کے وقوع کا نہایت تاکیدی اثبات کر دیا گیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے : ﴿زَعَمَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنۡ لَّنۡ یُّبۡعَثُوۡا﴾ "مغالطہ ہو گیا ہے ان کافروں کو کہ ان کو دوبارہ اٹھایا نہ جائے گا"۔ زعم کا لفظ اردو میں بھی بے بنیاد خیال کے معنوں میں مستعمل ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں کو بڑا زعم ہے' یعنی اسے اپنے بارے میں مغالطہ ہے اور وہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا ہے' درانحالیکہ اس کی اصل حیثیت کچھ نہیں ہے اور وہ محض ایک خیالِ خام اور ایک بے بنیاد ظن میں مبتلا ہے۔ کفّار اسی زعم اور خیالِ خام میں مبتلا تھے کہ مرنے کے بعد ان کو دوبارہ اٹھایا نہ جائے گا۔ قرآن مجید میں کفار کے اس اعتراض اور استعجاب کو بہت سے مقامات پر مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے' اور خاص طور پر مکی سورتوں میں ان کے اس خیالِ خام کی نفی اور بعث بعد الموت کے اثبات کے لئے آفاق و انفس سے مفصل دلائل دیئے گئے ہیں۔ یہاں ان دلائل و براہین کے اعادے کی بجائے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ : ﴿قُلۡ بَلٰی وَرَبِّیۡ لَتُبۡعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلۡتُمۡ﴾ "(اے نبی!) کہہ دیجئے کیوں نہیں' اور مجھے اپنے رب کی قسم ہے' تم لازماً اٹھائے جاؤ گے' پھر تم نے (دنیا میں) جو کچھ کیا ہے وہ لازماً تمہارے سامنے

رکھ دیا جائے گا۔" اس اسلوب میں جو زور اور تاکید ہے اس کا صحیح اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جو عربی زبان سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہوں۔ عربی زبان میں اس سے زیادہ تاکید کا کوئی اور اسلوب نہیں ہے کہ فعل مضارع سے پہلے لامِ مفتوح اور آخر میں نونِ مشدّد ہو۔ یہاں تاکید کا یہی اسلوب آیا ہے۔

اس آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا: ﴿وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ "اور یہ چیز اللہ پر بہت آسان ہے"۔ یعنی بظاہر تمہیں بہت مشکل معلوم ہو رہا ہے لیکن جب اللہ کو مان لیا جائے اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے تو اس استعجاب کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے؟ جس قادرِ مطلق نے پہلے پیدا کیا تھا اس کے لئے دوبارہ پیدا کرنا بہت آسان ہے۔

جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اس آیت مبارکہ میں کوئی عقلی استدلال یا منطقی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ یہاں دراصل خطابی اور اذعانی دلیل کا اسلوب ہے۔ یعنی نبی اکرم ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ پورے یقین و وثوق کے ساتھ اللہ کی قسم کھا کر اور اپنے رب کی شہادت پیش کرتے ہوئے ان منکرین سے کہہ دیجئے کہ "ایسا لازماً ہو کر رہے گا اور تم لازماً محاسبہ کے لئے دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔" زیادہ گہرائی میں غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ یہاں دراصل نبی اکرم ﷺ کی سیرت و شخصیت کا وزن بطور دلیل پیش کیا جا رہا ہے کہ غور کرو کہ یہ کون کہہ رہا ہے اور کس کی زبان مبارک سے یہ کلمات ادا کرائے جا رہے ہیں! اس کی سیرت اور اخلاق کا عالم کیا ہے! اس کی صداقت و امانت کے بارے میں تمہاری متفقہ رائے کیا ہے! وہ "الصادق" اور "الامین" شخص ہے جو قسم کھا کر بعث بعد الموت کی خبر دے رہا ہے اور پورے یقین اور اذعان کے ساتھ دے رہا ہے۔ یعنی وہ فلسفیوں کی طرح یہ نہیں کہہ رہا کہ میرا گمان یہ ہے' یا میرا خیال یہ ہے' یا میری عقل یہ حکم لگاتی ہے' یا مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے' بلکہ پورے وثوق کے ساتھ خبر دے رہا ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ گویا یہ فلسفیانہ کلام نہیں ہے کہ جس میں کسی شک و شبہ کا امکان ہو' بلکہ اللہ کا کلام ہے جو رسول ﷺ کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ لہٰذا اس میں شبہ کا ذرا سا بھی شائبہ موجود نہیں! مزید برآں رسولوں کا معاملہ محض "ایمان بالغیب" کا نہیں ہوتا بلکہ انہیں

حیاتِ دنیوی ہی میں "ملکوت السمٰوات والارض" یہاں تک کہ جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کرادیا جاتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو احوالِ آخرت کی جو خبریں دیں تو اپنے ذاتی مشاہدہ اور معائنہ کی اساس پر اور کامل یقین واذعان کے ساتھ دیں۔ پس معلوم ہوا کہ یہاں اگرچہ کوئی عقلی و منطقی دلیل موجود نہیں ہے لیکن اس اسلوبِ بیان اور اس اندازِ کلام میں ایک بڑی عظیم ازعانی و ایقانی دلیل مضمر ہے جس میں اصل وزن جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی سورج کے مانند روشن سیرت و شخصیت کا ہے۔ چنانچہ سیرت کی کتابوں میں ذکر موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جب کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر اپنا پہلا دعوتی و تبلیغی خطبہ ارشاد فرمایا تو پہلے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے مجھے کیسا پایا؟ گویا پہلے ان سے اپنی اس صداقت' امانت اور دیانت کی تصدیق و توثیق کرالی جسے وہ بہت پہلے سے تسلیم کرچکے تھے' پھر دعوت پیش فرمائی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مخاطبین یہ سوچیں کہ جس شخص نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو' جس کا شعار ہی صداقت وامانت ہو' جس نے کبھی کسی کو دھوکہ اور فریب نہ دیا ہو' کیا وہ اللہ پر جھوٹ باندھنے لگ جائے گا! کیا وہ پوری نوعِ انسانی کو فریب دینے پر آمادہ ہو جائے گا! پس حضور ﷺ کی یہی سیرت و کردار اور آپؐ کا یہی اخلاقِ حسنہ سورۃ التغابن کی ساتویں آیت کے پس منظر میں بطورِ دلیل پنہاں ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی دعوت کے ابتدائی دور کا ایک خطبہ بھی ملتا ہے جسے "نہج البلاغہ" میں نقل کیا گیا ہے اور جس میں بالکل وہی انداز' وہی اسلوب' فصاحت و بلاغت کا وہی معیار اور خطابت کی وہی شان ہے جو اس آیتِ مبارکہ کا طرۂ امتیاز ہے۔ حضورؐ خود بھی اس کے مدعی ہیں کہ "اَنَا اَفْصَحُ الْعَرَبِ" یعنی "میں عرب کا فصیح ترین انسان ہوں" اور واقعہ یہ ہے کہ آپؐ کا یہ خطبہ اس دعویٰ کی بہت بڑی دلیل ہے۔ ارشاد فرمایا :

((اِنَّ الرَّائِدَ لَایَکْذِبُ اَھْلَہٗ' وَاللّٰہِ لَوْ کَذَبْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَا کَذَبْتُکُمْ' وَلَوْغَرَرْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَاغَرَرْتُکُمْ۔ وَاللّٰہِ الَّذِی لَااِلٰہَ اِلَّا ھُوَاِنِّی لَرَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ خَاصَّۃً وَاِلَی النَّاسِ کَافَّۃً۔ وَاللّٰہِ لَتَمُوْتُنَّ کَمَا تَنَامُوْنَ' ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُوْنَ' ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ

بِمَا تَعْمَلُوْنَ' ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوْءِ سُوْءً' وَاِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا))

"لوگو! تم جانتے ہو کہ رائد (قافلہ کا رہبر و رہنما) اپنے قافلے کو کبھی دھوکہ نہیں دیتا۔ اللہ کی قسم! اگر (بفرض محال) میں تمام انسانوں سے جھوٹ کہہ سکتا تب بھی تم سے کبھی نہ کہتا اور اگر تمام انسانوں کو فریب دے سکتا تب بھی تمہیں کبھی نہ دیتا۔ اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں! میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف خصوصاً اور پوری نوع انسانی کی طرف عموماً ـــــ اللہ کی قسم! تم سب یقیناً مرجاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو' پھر یقیناً اٹھائے جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہو جاتے ہو۔ پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہو گا اور پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا' اچھائی کا اچھا اور برائی کا برا۔ اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لئے یا آگ ہے دائمی"

اب تک کے مطالعے پر ایک نگاہ بازگشت ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سات آیات میں ایمانیاتِ ثلاثہ یعنی توحید' رسالت اور آخرت کا بیان ہو گیا۔ چنانچہ توحید اور صفاتِ باری تعالیٰ کے ضمن میں چار آیات' رسالت کے موضوع پر دو آیات' اور آخرت یا معاد کے بارے میں ایک آیت وارد ہوئی۔ ان ایمانیاتِ ثلاثہ بالخصوص ایمان بالآخرت کی مزید تشریح ایک خطبۂ نبویؐ سے بھی ہمارے سامنے آگئی۔ اب اگلی یعنی آٹھویں آیت سے ایمان کی پرزور دعوت دی جا رہی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا﴾ "پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول ﷺ پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا (یعنی قرآن مجید)" ـــــ ان الفاظ میں اولاً اللہ پر ایمان کی دعوت دی گئی اور پھر ایمان بالرسولؐ کے ساتھ اس نورِ ہدایت پر ایمان کو بھی شامل کر لیا گیا جو وحی اور کتاب کی صورت میں رسولؐ پر نازل کیا گیا اور چونکہ بعد کی دو آیات (نمبر ۹ اور ۱۰) میں ایمان بالآخرت کی زوردار دعوت آ رہی ہے لہٰذا آیت نمبر ۸ کے اختتام پر ایک بار پھر اللہ کی صفتِ علم کا حوالہ دے دیا گیا کہ: ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ﴾ "اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے!" یعنی وہ تمہاری ہر ہر حرکت' ہر ہر عمل اور ہر ہر فعل ہی نہیں' تمہاری نیتوں اور ارادوں سے بھی باخبر ہے۔ یہاں تک کہ تمہارے تحت الشعور اور لاشعور بھی اس پر بالکل عیاں ہیں!

ہار اور جیت کے فیصلے کا دن

اگلی دو آیات (۹'۱۰) میں پھر ایمان بالآخرت کا بیان ہے۔ اس سے قبل آیت نمبر ۷ میں بھی ایمان بالآخرت کے اولین اور اہم ترین جزو یعنی بعث بعد الموت کا اثبات نہایت پرزور انداز میں ہو گیا ہے۔ اب ان دو آیات میں اولاً آخرت کی اصل حقیقت اجمالاً بیان کی گئی' یعنی قیامت کا دن ہی ہار اور جیت' اور کامیابی و ناکامی کے اصل فیصلے کا دن ہے۔ جو اس دن کامیاب قرار پائے گا وہی حقیقتاً کامیاب ہو گا اور جو اس روز ناکام قرار دے دیا گیا وہی اصلاً ناکام ہو گیا۔ گویا جو اس دن جیتا وہی جیتا اور جو اس دن ہارا وہی ہارا! ـــــ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ "وہ دن کہ جس دن وہ (اللہ) تمہیں جمع کرے گا جمع ہونے کے دن (یعنی یوم قیامت) وہی ہے ہار اور جیت کے فیصلے کا اصل دن" ـــــ "تغابن" بنا ہے لفظ "غبن" سے۔ غبن کا لفظ ہمارے یہاں اردو میں بھی مستعمل ہے' یعنی کسی کو نقصان پہنچانا' کسی کا مال دبا لینا' مالک کی اجازت اور اس کے علم میں لائے بغیر اس کے مال میں تصرف کر لینا' یہ تمام مفاہیم لفظ غبن میں شامل ہیں۔ لیکن جب یہ لفظ باب تفاعل میں "تغابن" کی صورت اختیار کرتا ہے تو اس میں مزید بہت سے معانی و مطالب شامل ہو جاتے ہیں۔ تغابن کا لفظ اس کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جو اس دنیا کے جملہ معاملات میں معلوم و معروف ہے۔ یعنی یہ کہ اس دنیا میں جو باہمی معاملات ہوتے ہیں ان میں ہر فریق چاہتا ہے کہ وہ دوسرے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے یا بالفاظِ دیگر دوسرے کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچائے۔ دکاندار چاہے گا کہ گاہک سے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرے جبکہ خریدار کی خواہش ہو گی کہ اسے داموں میں زیادہ سے زیادہ رعایت حاصل ہو۔ اسی طرح کاروبار دنیا کے ہر شعبے میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔ پس ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ زک پہنچانے کی کوشش کا نام ہے "تغابن"۔ اس تغابن کا ایک ظہور تو دنیوی معاملات میں ہر آن ہو رہا ہے کہ کسی کی جیت ہو رہی ہے اور کسی کی ہار' اور کسی کو نفع حاصل ہو رہا ہے اور کسی کو نقصان۔ لیکن اس دنیا کی ہار جیت بھی عارضی ہے اور نفع نقصان بھی عارضی۔ ہار جیت

کے فیصلے کا اصل دن یومِ قیامت ہے۔ اس لئے کہ اس دن کی جیت بھی ابدی ہوگی اور ہار بھی دائمی ہوگی اور نفع بھی مستقل ہوگا اور نقصان بھی دائمی ہوگا۔ اس کے لئے یہاں فرمایا گیا: "ذٰلِکَ یَوْمُ التَّغَابُنِ" اصل میں تو وہاں جا کر کھلے گا کہ کون کیا تھا اور کس کی حقیقت کیا تھی! اور کون بامراد ہوا اور کون نامراد! اور ہار کس کی ہوئی اور جیت کس کی! رہی اس دنیا کی ہار جیت اور کامیابی و ناکامی' تو یہ سب عارضی اور فانی ہیں۔ اصل تختہ' واصل باقی یعنی اصل بیلنس شیٹ تو قیامت کے روز سامنے آئے گی!

آگے اسی ہار جیت اور کامیابی و ناکامی کی تفصیل بیان ہوئی ہے:

﴿وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا یُّکَفِّرْ عَنْهُ سَیِّاٰتِهٖ وَیُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا' ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝﴾

"تو جو اللہ پر ایمان رکھے گا اور عمل کرے گا بھلے اور درست اللہ اس سے اس کی برائیوں کو دور فرما دے گا اور داخل کرے گا اسے ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی' جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ہے بڑی اور اصل کامیابی۔"

یہ جیت کی شرح ہو گئی' یعنی جنت میں داخلہ اور ہمیشہ کا خلود! گویا یہ ہے مستقل' واقعی اور حقیقی جیت! اس کے برعکس ہار کیا ہے؟ اسے آیت نمبر ۱۰ میں واضح فرما دیا گیا:

﴿وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا' وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۝﴾

"اور جن لوگوں نے انکار کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہ آگ والے ہیں' جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے' اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔"

اس موقع پر ایک اور ضروری بات بھی سمجھ لینی چاہئے۔ وہ یہ کہ قرآن مجید میں جہاں کفر اور تکذیب دونوں جرائم کا ذکر ساتھ ساتھ ہوتا ہے' وہاں کفر اس کیفیت کو ظاہر کرتا ہے کہ اللہ کی معرفت کی جو شہادتیں انسان کی اپنی فطرت اور اس کے اپنے باطن میں مضمر ہیں' انسان ان کو دبا دے' چھپا دے اور انہیں بروئے کار نہ آنے دے۔ اور تکذیب اس کے اوپر دہرا جرم ہے کہ جب رسول آئے' کتاب اتری' اور نورِ وحی نے حق کو بالکل

روشن اور مبرہن کر دیا تو اس نے اسے جھٹلا دیا۔ اس طرح دو جرم جمع ہو گئے۔ گویا کفر اور تکذیب بالکل ہم معنی نہیں ہیں بلکہ "ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" کے مصداق ظلم پر مزید ظلم اور ایک جرم پر دوسرے کے اضافے کے مترادف ہیں۔

خلاصۂ مباحث

سورۃ التغابن کے پہلے رکوع کی مختصر تشریح و توضیح ختم ہوئی۔ اس رکوع میں سب سے پہلے اللہ کی ہستی' اس کی توحید اور اس کی صفاتِ کمال پر آیاتِ آفاقی کی شہادت کو اس پیرائے میں بیان کیا گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے' اللہ کی تسبیح کر رہا ہے۔ اور پھر اس کی جلالتِ شان اور اس کی بعض صفاتِ کمال خصوصاً قدرت اور علم کا بیان ہوا۔ پھر رسالت کے ذیل میں رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کے عذابِ الٰہی سے ہلاک ہونے کا بیان بھی آگیا اور رسالت کے باب میں ان کی اصل گمراہی کی نشاندہی بھی کر دی گئی کہ انہوں نے بشریت اور نبوت و رسالت کو ایک دوسرے کی ضد خیال کیا۔ اس کے بعد منکرینِ بعث بعد الموت کی شدت کے ساتھ تردید اور بعث بعد الموت' حشر و نشر اور جزا و سزا کا بیان اور اس حقیقت کی وضاحت ہوئی کہ اصل ہار جیت اور کامیابی و ناکامی کا فیصلہ قیامت کے دن ہو گا۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ' رسول ﷺ اور قرآن مجید پر ایمان کی پرزور دعوت بھی آگئی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حقیقی ایمان نصیب فرمائے' ہمارے قلوب و اذہان کو ایمان کے حقیقی نور سے منور فرمائے اور ہمیں آخرت کی فوز و فلاح سے بہرہ ور فرمائے۔

آمین یا رب العالمین!

(جاری ہے)

ڈاکٹر اسرار احمد کی مقبول عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

خود پڑھئے اور دوستوں اور عزیزوں کو تحفہ پیش کیجئے!

جہاد کا قرآنی تصور (۲)

ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی

اللہ کے دین کو تمام عالم میں جاری و ساری کرنا اور تمام مذاہب و ادیان پر اسے غلبہ و تفوق سے ہمکنار کرنا انتہائی عظیم اور مقدس ترین مشن ہے۔ اس مشن عزیز میں کامیابی کے لئے وہ مرحلہ جانفزا بھی آتا ہے جو عشق حقیقی اور حصول جنت کی راہ میں ہر بندۂ مومن کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے' جسے ہم جاں فروشی سے موسوم کرتے ہیں یا جسے ہم جسم و جان کے جہاد سے تعبیر کرتے ہیں۔ فرمایا گیا :

﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ﴾ (التوبہ : ۱۱۱)

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے بدلے میں خرید لئے ہیں"۔

یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی شانِ کریمی ہی ہے کہ جسم و جان اور مال و زر کے خود اپنی عطا کردہ نوازش کے باوجود یہ فرماتا ہے کہ اگر اللہ کا کوئی بندہ جہنم کے دہکتے ہوئے شعلوں سے نجات پا کر اپنی جنت عزیز رکھتا ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ حق و باطل کی معرکہ آرائی میں اسے تخلف و ادبار کا طریقہ نہیں بلکہ فرطِ اشتیاق کے ساتھ برپا کی ہوئی اس جنگ میں اقدام و دلجمعی کا شیوہ اختیار کرنا چاہئے یہاں تک کہ راہ حق میں جان جیسی متاع عزیز بھی اگر نچھاور کرنا پڑے تو اسے اپنی سعادت و کامرانی کا توشہ سمجھنا چاہئے۔ ایسے ہی جاں نثارانِ حق کی تعریف اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں بایں الفاظ کرتا ہے :

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ﴾ (البقرہ : ۲۰۷)

"اور انسانوں ہی میں کوئی ایسا بھی ہے جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے"۔

بلاشبہ جہاد کا اول مرحلہ نفسِ امارہ سے شروع ہوتا ہے اور اسے اس لحاظ سے فضیلت حاصل ہے کہ نفسِ امارہ کو شکست دینے کے بعد جہاد کے وسیع ترین عملی میدان کو سر کرنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی آخری منزل جو جاں فروشی یا جاں نثاری سے عبارت ہے بلاپس وپیش اور تردد میں پڑے بغیر حاصل کرلی جاتی ہے۔ نفسانی خواہشات کو پامال کرنا' مخصوص اوقات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا' اجتماعات اور کانفرنسز کا انعقاد کرانا اور قومی اور بین الاقوامی اجتماعات کے ذریعے ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد کو مبادیات دین سے آشنا کرنا اور خلوص وللّٰہیت کے ساتھ انفرادی یا اجتماعی طریقے سے آبادیوں میں نکل کر پیغام حق سنانا بلاشبہ داعی حق کے فرائض وواجبات میں ہیں۔ اور یہ سب مستحسن اور لائق صد ستائش اعمال ہیں اور بلاشک وریب یہ سب جہاد فی سبیل اللہ کے زمرے میں آتے ہیں۔ لیکن فتنہ انگیزیوں اور فساد کاریوں کا قلع قمع کرنے' اللہ کی زمین کو عدل وانصاف اور امن وسکون کا گہوارہ بنانے اور من حیث المجموع انسانیت کو لبادۂ انسانیت زیب تن کرانے کے لئے اور اللہ کے دین کو تمام عالم پر غالب کرنے کے لئے ایک آخری کوشش بھی ہے' جو قتال فی سبیل اللہ کے نام سے جانی جاتی ہے' جو اللہ کے صالح بندوں کے ذریعے بدرجہ مجبوری اور آخری صورت میں اختیار کی جاتی ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کی یہ آخری منزل عام قتال یا جنگ کے ہم معنی نہیں ہے۔ اس کا مقصد جوش انتقام میں خونریزی وخونخواری نہیں ہے' جیسا کہ معاندینِ اسلام بالخصوص یوروپین مفکرین نے اسلام کے رخِ زیبا کو داغدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلام امن وسلامتی کا دین ہے جو خود اس کے نام میں مضمر ہے اور جس کو پورا پورا اختیار کرنے کی تلقین اس کے ہر ہر علمبردار کو کی جاتی ہے :

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ... ﴾

(البقرہ : ۲۰۸)

"اے ایمان لانے والو اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ"۔

اسلام اس دنیا کو امن وسکون کا گہوارا دیکھنا چاہتا ہے' اور ظلم وعدوان اور بغاوت

و سرکشی کو امراضِ خبیثہ قرار دیتا ہے جن کے ذریعے انسان کا امن و سکون درہم برہم ہو جاتا ہے اور انسانیت و شرافت کے تار و پود بکھر جاتے ہیں۔ چنانچہ اللہ عزوجل اقامت دین کے ذریعے اس دنیا کو جنت نشان بنانے کے لئے فتنہ و فساد اور بغاوت و سرکشی کے علمبرداروں سے نبرد آزمائی کو ایک ناگزیر اور آخری صورت قرار دیتا ہے' جس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی یہ زمین لوٹ کھسوٹ' ظلم و عدوان' اضطراب و بے چینی اور پریشانی و سراسیمگی جیسے کرپشن سے پاک ہو اور اس زمین پر کسی کی زندگی اجیرن نہ ہو۔ خواہ کوئی کالا ہو یا گورا' امریکہ کا رہنے والا ہو یا افریقہ کا اور کوئی غریب ہو یا امیر' ہر ایک امن و سکون کی نعمت سے بہرہ ور ہو۔ پوری انسانی سوسائٹی کے مفادات کے تحفظ کے لئے اگر چند فتنہ پروروں اور شرپسندوں کو ان کے کیفر کردار تک پہنچانے کی تدبیر کی جاتی ہے تو اسے خونخواری اور خونریزی کا نام دینا ایک سنگین جرم اور بڑی ناانصافی ہے۔ یہ مقدس عمل دراصل جہاد فی سبیل اللہ کی وہ آخری منزل ہے جسے حالات کے تقاضاؤں کے تحت سر کرنا بھی ایمان و ایقان کا معیار قرار دیا جاتا ہے۔ سورۃ الحجرات کی آیت اس ضمن میں بڑی واضح ہے :

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾

(الحجرات : ۱۵)

"فی الحقیقت مومن تو وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر وہ شک و ریب میں نہ پڑے اور اپنے مالوں اور جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا"۔

اسلام میں تقویٰ اعمال و افعال کی قبولیت میں بہترین اثاثہ یا سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وہ تقویٰ ہے جس کی بنیاد پر معزز و محترم اور حقیر و کم تر ہونے کا معیار قائم ہوتا ہے۔ جن کے دلوں کی دنیا پر خشیتِ الٰہی کی حکمرانی ہوتی ہے وہ محض دن کی روشنی میں یا چوراہوں اور شاہراہوں پر ہی نہیں بلکہ رات کی تاریکیوں میں' آبادی سے دور کسی جنگل یا ویرانے میں اور کسی مخصوص چہار دیواری یا خطۂ ارض میں بھی خیرات و حسنات کے علمبردار اور منکرات و سیئات کے باغی ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ اسی بناء پر اللہ کے

نزدیک یہ محبوب و مکرم بن جاتے ہیں۔ اس خشیتِ الٰہی اور خدا ترسی میں جو جتنا زیادہ بڑھا ہوا ہو اسی لحاظ سے اللہ کی بارگاہ میں عزت و تکریم کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ اعلان سنئے :

﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ﴾ (الحجرات : ۱۳)

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ مکرم وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہے"

مبارک سے مبارک ترین عمل بھی اللہ کے دربار میں شرف قبولیت سے ہمکنار نہیں ہو سکتا جب تک وہ خلوص و للّٰہیت کے ساتھ انجام نہ دیا جائے۔ چنانچہ جانوروں کی قربانی کی شکل میں خلیل اللہؑ کی سنت کی انجام دہی یقیناً محبوب و مبارک عمل ہے لیکن اگر یہی عمل نام و نمود اور اشتہار کے جذبے کے تحت ہو تو یہ مبارک عمل بھی راندۂ درگاہ قرار پاتا ہے۔ قرآن کا یہ اعلان سنئے :

﴿لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ﴾ (الحج : ۳۷)

"اللہ کی بارگاہ میں جانوروں کا گوشت اور ان کا خون ہرگز نہیں پہنچتا ہے' ہاں مگر تمہارا تقویٰ ہی وہاں پہنچتا ہے"۔

جہاد اپنے ابتدائی مراحل سے لے کر انتہائی مراحل تک سرتاپا محبوب و مقدس عمل اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ نام و نمود اور نمائش و اشتہار کے جذبے سے پاک ہو کر اور اپنے ذاتی مفادات کو تج کر اسے صرف اللہ عزّوجل کی خوشنودی کے حصول کے لئے انجام دیا جائے۔ اور یہی مقدس عمل جہاد فی سبیل اللہ سے موسوم ہو گا۔ اس کے برعکس خواہشاتِ نفسانی سے نبرد آزمائی' زبان و قلم کے استعمال یا پھر مال و اولاد اور اپنی جانوں کو اللہ کی راہ میں قربان کر دینے کے مراحل میں اشتہار و نیک نامی کا جذبہ کارفرما ہو تو یہی پاک و مقدس عمل جہاد فی سبیل الطاغوت بن جاتا ہے' جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ ہم جہاد فی سبیل اللہ کی دینی اور دنیوی برکتوں سے محروم رہ جاتے ہیں بلکہ ذلت و نکبت کی عمیق کھائیوں میں گر جاتے ہیں۔

قرآن پاک میں متعدد مقامات پر ٹھوس ایمان و یقین کے ذریعے جہاں اہل ایمان کو فکری جہاد میں محاذ آرائی کی تلقین کی گئی وہیں عمل صالح کے ذریعے عملی اور کے اثاثہ کو فوز عظیم کا توشۂ راہ بتایا گیا۔ اور یہی عمل صالح جب پورے جوش و خروش' ارتکازِ توجہ اور اپنی انتہائی قوت صرف کر کے للہ اور فی اللہ انجام دیا جائے تو جہاد فی سبیل اللہ کے الفاظ سے تعبیر کا مجاز و مستحق بن جاتا ہے۔ متعدد آیاتِ قرآنی ایسی ہیں جہاں اللہ و رسول پر ایمان و یقین کے بعد واضح الفاظ میں جہاد کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور ایمان کے اولین عملی تقاضے کی حیثیت سے انجام دہی کی تلقین کی جاتی ہے۔ سورۃ الصف میں حقیقی تجارت کی نشاندہی اور اس کے اختیار کرنے میں جہنم کے دہکتے ہوئے شعلوں سے نجات یابی کی ضمانت کے بعد اس تجارت کے عوامل و اسباب کا تذکرہ ہوتا ہے :

﴿ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ﴾ (الصف : ۱۱)

"ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر' اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو"۔

سورۃ الحج میں ارشاد ہوتا ہے :

﴿ وَجَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ﴾ (الحج : ۷۸)

"اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے"۔

دوسری جگہ نبی ﷺ کو مخاطبِ خاص بنا کر تلقین فرمائی جاتی ہے :

يٰٓاَيُّهَا النَّبِىُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (التوبہ : ۷۳' التحریم : ۹)

"اے نبی (ﷺ) کفار و منافقین دونوں کا پوری قوت سے مقابلہ کیجئے اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آیئے"۔

چونکہ اسلام اللہ واحد کا خالص دین ہے جو دیگر افکار و نظریات اور ادیان و مذاہب پر غالب ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے لہٰذا اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کی حکمرانی اور اس کے قانون کی بالادستی اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک فکری اور

نظریاتی لحاظ سے رسوخ واستحکام پیدا نہ کرلیا جائے اور جبھی جہاد جیسا مقدس فریضہ انجام دہی کے لحاظ سے بار آور ہو سکتا ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کے اس عمل خیر کے نتیجے میں دونوں جہان کی سعادتیں اور کامرانیاں اہل ایمان کی تقدیر بن جاتی ہیں۔ مجاہد فی سبیل اللہ اپنے مقدس ترین عمل کی انجام دہی کے طفیل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حقیقی ایمان کی سند کا مستحق بنتا ہے اور رضائے الٰہی اور رزق طیب جیسی اللہ داد نوازش کا سزاوار قرار دیا جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ملاحظہ فرمایئے :

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝﴾ (الانفال : ۷۴)

"اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جدوجہد کی اور جنہوں نے لوگوں کو پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے"۔

میدان عمل میں مصروف مجاہد فی سبیل اللہ کے لئے فوز و فلاح اور رشد و ہدایت کی راہیں ہموار ہو جاتی ہیں۔ فرمان الٰہی سنئے :

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ....﴾ (العنکبوت : ۶۹)

"اور جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے ہم انہیں یقیناً اپنے راستے دکھائیں گے"۔

دوسری جگہ ایسے لوگوں کو رحمتِ الٰہی کا امیدوار قرار دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ﴾ (البقرہ : ۲۱۸)

"بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور جہاد کیا وہ رحمتِ الٰہی کے (جائز) امیدوار ہیں"۔

اقامتِ دین کی جدوجہد کی راہ میں دنیا اور سامان دنیا مختلف طریقوں سے ایک بندۂ

مومن کے لئے سامان آزمائش ہیں۔ اس لئے اسے تنبیہ کیا جاتا ہے کہ مال و اولاد سے بے جا محبت اور حرص کے نتیجے میں وہ اپنی عاقبت نہ بگاڑ لے :

"یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝﴾

(المنافقون : ۹)

"اے ایمان لانے والو' تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں' اور جو لوگ اللہ کے ذکر سے غافل ہو گئے وہی خسارے میں رہنے والے ہیں"۔

اور دوسری طرف فلاح حقیقی کے حصول کی تحریض و تشویق کے ذریعے اسباب دنیا کو توشہ آخرت بنانے کی تلقین کی جاتی ہے :

﴿ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ .... ﴾ (المنافقون : ۱۰)

"اور تم لوگ (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کو موت آ جائے...."۔

انفاق فی سبیل اللہ کا دائرہ چھوٹے چھوٹے دینی اور فلاحِ انسانیت سے متعلق کاموں سے لے کر جہاد کی آخری منزل ـــــ قتال ـــــ تک محیط ہے۔ مال و زر کو سامانِ آزمائش اور توشۂ کامیابی ہونے کی وجہ سے اگر اسے اللہ کے دین کی سرفرازی کے لئے وقف کر دیا جائے تو بندۂ مومن کی یہ ادا اللہ کو بڑی بھا جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں جانوں کو اللہ کی راہ میں نچھاور کر دینے کے عوض اللہ رب العزت کے انعام و اکرام کی بشارت دی جاتی ہے وہاں اس سے پہلے اللہ کی راہ میں مال و زر لٹا دینے کا ذکر خیر بھی ہوتا ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کے اس مقدس فریضے کی ادائیگی میں مال و جان انتہائی قیمتی اثاثہ ہیں جنہیں ایک بندۂ مومن غلبۂ دین کی خاطر لگا دیتا ہے تو یقینی طور پر اللہ کے فضل و کرم کا مستحق قرار پاتا ہے۔ مال و جان کی اسی اہمیت کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے مالوں اور جانوں سے جہاد کرنے والے سرفروشان دین کی مخصوص طریقے سے پذیرائی کی۔ فرمایا :

﴿ لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ ﴾

(التوبہ : ۸۸، ۸۹)

"بخلاف اس کے رسول نے اور ان لوگوں نے جو رسول کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی جان و مال سے جہاد کیا اور اب ساری بھلائیاں انہی کے لئے ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ہے عظیم الشان کامیابی"۔

مال و زور اور جسم و جان کے ذریعے مصروف مجاہدین فی سبیل اللہ کی عظمت و برتری کی سند اور ان کے لئے خیر و حسن کی ضمانت ایک جگہ ان الفاظ مقدسہ میں دی جاتی ہے :

﴿ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ﴾

(النساء : ۹۵)

"اللہ تعالیٰ نے جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بیٹھ رہنے والوں کے مقابلے میں بڑھا دیا ہے اور ہر ایک سے بھلائی کا وعدہ کیا ہے"۔

ایک مؤمن اگر آخرت کی ابدی اور قطعی کامیابی کے لئے فکر مند ہو جائے اور جہادِ زندگانی میں مصروفِ عمل ہوتے ہوئے اپنے آپ کو اس کا مستحق بنا لے تو یہ دنیا خود ہی بطورِ نوازش اسے ملتی ہے۔ ایمان و ایقان اور جہاد فی سبیل اللہ وہ سرمایۂ فلاح ہے جس کے کماحقہٗ استعمال کے بعد دونوں جہاں کی سعادت و حکمرانی ہاتھ آجاتی ہے۔ اللہ و رسول پر ایمان کامل کے بعد مالوں اور جانوں کے ذریعے جہاد وہ عظیم ترین عمل ہے جس کی انجام دہی کے بعد اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ :

﴿ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِىْ جَنّٰتِ عَدْنٍ' ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا.... ﴾ (الصف : ۱۲-۱۳)

"(اس کے عوض) اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور تمہیں ایسے باغات میں داخل کر دے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اور عدن کے باغات میں عمدہ ٹھکانے عنایت فرمائے گا۔ یہی بہت بڑی کامیابی ہے اور دوسری وہ تمام چیزیں عنایت کرے گا جنہیں تم چاہو گے"۔

اللہ ذوالجلال کی زمین سے فتنہ و شرپسندی کا قلع قمع کرنے اور اس کے دین کے تفوق و برتری کی غرض سے اللہ کی راہ میں جانوں کے ذریعے جہاد کرنے والا مردِ مومن غازی ہونے کی صورت میں بھی اور جامِ شہادت نوش کرنے کی صورت میں بھی دونوں صورتوں میں اللہ کی عنایتوں کا مستحق ہوتا ہے۔ اللہ کی راہ میں اللہ کی دی ہوئی جان عزیز کو نچھاور کر دینا اللہ عزّوجل پر کوئی احسان نہیں ہے ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس کے باوجود اللہ تعالیٰ مالوں اور جانوں کے بدلے میں حصولِ جنّت کو یقینی قرار دیتا ہے اور اللہ کی راہ میں جامِ شہادت نوش کرنے کے عوض اسے حقیقی زندگی کی لذت سے آشنا کرا دیا جاتا ہے اور تلقین کی جاتی ہے کہ اسے مُردہ نہ کہا جائے۔ شہداءِ حق کے اعزاز و اکرام کا اعلان اللہ رب العزت کی زبانی سنئے :

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ' بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ○ ﴾ (البقرہ : ۱۵۴)

"اللہ کی راہ میں جو لوگ مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم کو اس کا شعور نہیں ہے"۔

دین اسلام اللہ واحد کا دین ہے جو بے کم و کاست پوری انسانیت کی خیر و فلاح کا ضامن ہے۔ اسی دین حق کو ادیانِ باطلہ پر برتر اور غالب کر دینے کی انتہائی کوشش کا نام جہاد ہے۔ لفظ جہاد قتال کے مترادف یا ہم معنیٰ نہیں ہے بلکہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کی

انتہائی کوشش صرف کر دینے سے عبارت ہے۔ اس کا میدانِ عمل نفسِ امارہ سے لے کر قتال فی سبیل اللہ تک محیط ہے۔ نفس امارہ سے جہاد کے بعد اس محبوب و مقدس ترین مشن کی انتہائی منزل فکری جہاد کی وسیع شاہراہوں سے ہو کر گزرتی ہے جہاں ایک مجاہد زبان و قلم کے ساتھ ساتھ مال و زر اور وقت کا قیمتی اثاثہ اللہ کی راہ میں لگاتا ہے۔ غلبہ دین کی یہ انتہائی جدّوجہد خواہ کسی جہت سے ہو اللہ واحد کے دین کی سربلندی کے لئے ہو اور خالصتاً اللہ ہو تو اسی کو جہاد فی سبیل اللہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بصورت دیگر یہ مقدس عمل جہاد فی سبیل الطاغوت قرار پاتا ہے۔ اس مقدس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے والا بندۂ مومن مجاہد فی سبیل اللہ سے ملقّب ہو جاتا ہے جس کی بدولت اس کے لئے دونوں جہان کی خیر و فلاح اور خوشحالی و فارغ البالی کی راہیں روشن اور منور ہو جاتی ہیں اور ان کی یافت آسان ہو جاتی ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کی آخری منزل قتال فی سبیل اللہ ہے جسے اللہ کی زمین سے فتنہ و فساد ختم کرنے اور عامتہ الناس کو امن و سکون اور انسانیت نوازی و انسان دوستی کی نعمت سے مالا مال کرنے کے لئے انجام دیا جاتا ہے۔ اس مقدس مہم کے اول مرحلے میں مال کی قربانی درکار ہوتی ہے اور آخری مرحلے میں جانِ عزیز کی۔ جان و مال کی قربانی جہاد فی سبیل اللہ کے اثاثوں میں بہترین اثاثہ ہے جو سرفرازی دین کی راہ میں وقف ہونے پر مخصوص فضیلت و استحقاق کا موجب بنتا ہے۔ آخرت کی حتمی اور ابدی مسرتیں حاصل ہوتی ہیں اور اللہ کی الطاف و عنایات کے نتیجے میں اس کی یہ عارضی دنیا بھی خیر و حسن کا مرقع بن جاتی ہے۔ میدان جنگ میں سرگرمی عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اگر مجاہد فی سبیل اللہ جام شہادت نوش کرلیتا ہے تو اسے اللہ کی محبوبیت کی معراج مل جاتی ہے اور اسے حقیقی زندگی کی سند سے شرف و اعزاز بخشا جاتا ہے۔

دور حاضر میں مذہب سے بیزاری

محاضرات کے پہلے دن جناب باسط بلال کوشل کا لیکچر بعنوان :

The Modern Predicament of Religion

مرتب : ڈاکٹر احمد افضال

باسط بلال کوشل کا نام قارئین "حکمت قرآن" کے لئے نامانوس نہیں۔ نیو جرسی امریکہ میں قائم تنظیم اسلامی کی شاخ سے وابستہ اس ہونہار نوجوان نے دو سال قبل قرآن کالج، لاہور سے ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس کی تکمیل کی تھی۔ قبل ازیں وہ امریکہ کے چوٹی کے تعلیمی اداروں سے سیاسیات (پولیٹیکل سائنس) اور علوم اسلامیہ میں ایم اے کر چکے تھے۔ پچھلے سال باسط بلال نے محاضرات قرآنی کے مرکزی مقرر کے طور پر قرآن آڈیٹوریم میں انگریزی زبان میں لیکچر دیئے اور نہایت عمدگی کے ساتھ فکر جدید کی خامیوں کو اجاگر کرتے ہوئے فکر و فلسفہ کی سطح پر اسلام کی حقانیت کو مبرہن کیا۔ ان کے لیکچرز بہت دلچسپی سے سنے گئے اور متعدد قابل ذکر حلقوں کی جانب سے ان کے بارے میں تحسین آمیز تبصرے سننے کو ملے۔ اس سال وہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی دعوت پر پاکستان تشریف لائے تو ان کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قرآن آڈیٹوریم میں ۱۳/ اور ۱۴ جون کو ان کے دو لیکچرز کا پروگرام ترتیب دیا گیا۔ موسم کی شدت کے باعث گو دونوں دن حاضری پچھلے سال کے مقابلے میں کم رہی تاہم تیسرے دن سوال و جواب کی نشست میں سامعین کی ذوق و شوق کے ساتھ شرکت اس امر کی غماز تھی کہ سامعین نے باسط بلال کے پیش کردہ افکار و خیالات کو غیر معمولی دلچسپی اور توجہ سے سنا ہے۔ باسط بلال کے لیکچرز کا یہ پہلو نہایت غیر معمولی ہے کہ وہ سامع کے علم میں اضافے اور فکری جلا کا موجب ہی نہیں ہوتے اس کے ایمان میں ایزادگی کا باعث بھی بنتے ہیں۔ ذیل میں ان کے حالیہ لیکچرز میں سے پہلے لیکچر کا ترجمہ ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے جسے ہمارے رفیق کار ڈاکٹر احمد افضال نے اردو زبان کے قالب میں ڈھالا ہے۔ (ادارہ)

گفتگو کا باقاعدہ آغاز کرنے سے پہلے مہمان مقرر نے واضح کیا کہ اگرچہ اسلام عام معنوں میں محض ایک مذہب نہیں بلکہ دین ہے، تاہم اسلام کی بنیاد بعض "مذہبی" اصولوں پر قائم ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دور حاضر میں اسلام کی صحیح صورتحال کو سمجھنے کے لئے لازم ہے کہ "مذہب" کی عمومی صورتحال ہمارے سامنے ہو۔ چونکہ اسلام کی بنیاد میں مذہبی اصول موجود ہیں، لہٰذا جو شے دنیا کے مذاہب پر اثر انداز ہوتی ہے وہ لامحالہ

اسلام پر بھی اثر انداز ہو گی۔

اپنے خطاب کے پہلے حصے میں مہمان مقرر نے مذہب کی ضرورت کو واضح کیا۔ انہوں نے کہا کہ انسان فطری طور پر اس امر سے آگاہ ہے کہ یہ عالم مادی ہی اصل حقیقت نہیں ہے' بلکہ اس عالم کے علاوہ بھی ایک ماورائی اور غیبی عالم موجود ہے۔ مادی اور نظر آنے والی کائنات کے علاوہ ایک نظر نہ آنے والا عالم بھی اپنا وجود رکھتا ہے۔ اول الذکر سے مراد وہ عالم ہے جو سائنسی قوانین کے تابع ہے' خواہ یہ قوانین انسان کے علم میں ہوں یا ابھی اس کے دائرہ علم سے باہر ہوں۔ ثانی الذکر سے مراد وہ عالم ہے جو طبیعیات' حیاتیات' یا کیمیا کے قوانین کے تابع نہیں ہے۔ انسان فطری طور پر اس امر سے بھی خوب واقف ہے کہ زندگی اور وجود کے اہم ترین مسائل کا تعلق اس غیبی اور ماورائی عالم سے جڑتا ہے۔ چنانچہ دور حاضر کا ایک فلسفی Ludwig Wittgenstein کہتا ہے کہ "سائنس کی تمام باتیں سن لینے کے بعد ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ زندگی کے اصل اور بنیادی مسائل تو ابھی زیر بحث ہی نہیں آئے۔" مادی اور نظر آنے والی کائنات کے رازوں کو دریافت کرنے کے حوالے سے سائنس کے کارنامے شک و شبہ سے بالاتر ہیں' لیکن جہاں تک غیبی اور ماورائی عالم کا تعلق ہے تو اس ضمن میں سائنس کا ایک متضاد کردار ہمارے سامنے آتا ہے۔ ایک طرف تو یہ حقیقت ہمارے سامنے موجود ہے کہ سائنس ہمیں عالم غیب کے متعلق کوئی تفصیل نہیں بتا سکتی' لیکن دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ آج یہی سائنس عالم غیب کے وجود کو ثابت کر رہی ہے۔ سائنس کے اس متضاد (Paradoxical) کردار کو واضح کرنے کے لئے مہمان مقرر نے دو مثالیں پیش کیں۔ کائنات کی ابتداء کے حوالے سے نظری طبیعیات میں Big Bang کا نظریہ قبول عام حاصل کر چکا ہے۔ یہ نظریہ ثابت کرتا ہے کہ زمان و مکان کی چار جہتوں کے علاوہ بھی بہت سی جہتیں (Dimensions) اپنا وجود رکھتی ہیں' لیکن سائنسی تحقیق کے ذریعے ان غیبی جہتوں سے پردہ اٹھانا ممکن نہیں ہے اسی طرح کائنات میں Black Holes کا وجود بھی ثابت ہو چکا ہے' لیکن سائنس کسی بھی طریقے سے یہ معلوم کرنے کے قابل نہیں ہے کہ ان Black Holes کے اندر کیا ہے یا کیا ہو رہا ہے۔ جدید نظری طبیعیات

(Theoretical Physics) میں کئی نئے نظریات ابھر رہے ہیں' مثلاً Wormholes اور Parallel Universes کا وجود اور پانچ' دس' بلکہ چھبیس جہتی مکان (space) کا تصور۔ لیکن سائنس کے قوانین ان میں سے کسی شے پر بھی منطبق نہیں ہوتے۔ ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ جدید سائنس ایک غیبی عالم کے وجود کا اقرار کرنے کے باوجود اس غیبی عالم کو سمجھ لینے سے قاصر ہے۔ دوسروں لفظوں میں سائنس نے ہمیں عالم شہود (visible realm) کی سرحد تک پہنچا دیا ہے جہاں سے عالم غیب (Invisible realm) کا آغاز ہوتا ہے' لیکن وہ اس عالم غیب کو سمجھنے کے قابل نہیں ہے۔ صرف مذہب ہی وہ ذریعہ علم ہے جو اس غیبی عالم کو ہمارے لئے قابل فہم بناتا ہے اور عالم شہود اور عالم غیب کے باہمی تعلق کو واضح کرتا ہے۔ گویا جہاں سائنس اپنے ہتھیار ڈال دیتی ہے وہاں سے مذہب اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے۔

فاضل مقرر نے کہا کہ اس موقع پر ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ مذہب کا اپنا ذریعہ علم کیا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ سائنسی علم کے دو بنیادی ذرائع ہیں : تجرباتی ذرائع (emperical sources) اور تجزیاتی ذرائع (analytical sources)۔ اول الذکر سے مراد وہ علم ہے جو حواس خمسہ کے استعمال سے حاصل ہوتا ہے اور ثانی الذکر سے مراد وہ علم ہے جو عقل اور منطق کے استعمال سے حاصل ہوتا ہے۔ فاضل مقرر نے کہا کہ تمام مذاہب تین امور پر متفق ہیں' اولاً ایک خالق جو تمام کائنات کا مالک ہے' ثانیاً اس خالق کا انسانوں میں سے بعض افراد کے ذریعے بقیہ انسانوں کو عالم غیب کے حقائق سے مطلع کرنا' اور ثالثاً موت کے بعد زندگی کا اثبات۔ کائنات کے خالق کی طرف سے بعض مخصوص انسانوں کو عطا ہونے والا علم دراصل مذہبی علم (religious knowledge) کا منبع و سرچشمہ ہے اور یہی وہ ذریعہ علم ہے جسے وحی (revelation) کہا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا سائنس اور وحی کے مابین ذرائع علم ہونے کے حوالے سے کوئی تعلق موجود ہے' اگر ہے تو اس تعلق کی نوعیت کیا ہے؟

فاضل مقرر نے کہا کہ سائنس سے حاصل کردہ علم اولاً حواس خمسہ سے ملنے والی معلومات (sense data) پر مبنی ہوتا ہے اور ثانیاً ان معلومات کی بنیاد پر عقلی غور و فکر

کے ذریعے مختلف نظریات تشکیل دیئے جاتے ہیں۔ علم بالحواس میں غلطی کے امکانات بہت ہوتے ہیں کیونکہ انسانی حواس (senses) معلومات کے اخذ میں دھوکہ کھا سکتے ہیں۔ اس علم کی تہذیب و ترتیب اور اسے discipline کرنے کے لئے عقلی و منطقی تجزیہ و استدلال (analytical reasoning) کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اول الذکر کو سائنسی ذریعہ علم میں افقی خط (X-axis) سے اور ثانی الذکر کو عمودی خط (Y-axis) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ فلاسفہ نے صرف ان ہی دونوں ذرائع کو قابل اعتماد ذرائع علم سمجھا ہے اور اسی لئے وہ مذہبی ذریعہ علم یعنی علم بالوحی کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ تاہم جدید دور کے سائنس دانوں نے اس ضمن میں نسبتاً محتاط روش اختیار کی ہے' اور وہ بالعموم علم بالحواس اور علم بالعقل کے علاوہ ایک تیسرے ذریعہ علم کو بھی درست اور جائز (valid) سمجھتے ہیں جسے وجدان (intuition) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ ذریعہ علم جو نہ محسوسات سے متعلق ہے اور نہ عقلی استدلات سے تعلق رکھتا ہے' ایک تیسرے خط یعنی Z-axis سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ فاضل مقرر نے واضح کیا کہ سائنس کے سیاق و سباق میں Z-axis سے ان کی مراد وحی نبوت نہیں بلکہ الہام و کشف ہے۔

حواس' عقل' اور وحی کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب باسط بلال نے کہا کہ یہ تینوں ذرائع باہم متضاد یا متناقض نہیں ہیں بلکہ در حقیقت یہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ جس طرح عقل کے ذریعے ہم حواس سے ملنے والی معلومات کو نظم و ضبط میں لاتے ہیں' اسی طرح وحی کے ذریعے ہم عقل سے حاصل کردہ نتائج کی صحیح تشریح و تعبیر کرتے ہیں۔ عقل کے ذریعے حواس خمسہ کی غلطیوں کو درست کیا جاتا ہے اور وحی کے ذریعے عقل کی غلطیوں کی تصحیح ہوتی ہے۔ فاضل مقرر نے کہا کہ جدید سائنس کی ترقی دراصل علم بالحواس کو عقلی استدلالی طریقہ کار کے ذریعے نظم و ضبط میں لانے کی بدولت ہوئی ہے' اور اسی طرح انسانی ارتقاء کی اگلی منزل اس وقت طے ہوگی جب ہم عقلی استدلالی طریق کار کو وحی آسمانی سے ملنے والی ہدایت کے تابع کردیں گے۔

فاضل مقرر نے کہا کہ چونکہ ہمیں اپنی روزمرہ زندگی میں مادی عالم یا عالم مشہود ہی سے براہ راست واسطہ رہتا ہے لہٰذا ہم غیر مادی عالم یا عالم غیب سے غافل ہو جاتے ہیں

انہوں نے کہا کہ یہ مذہب ہی ہے جو ہمیں مسلسل یاد دلاتا رہتا ہے کہ اس مادی عالم میں مقصدیت صرف اس کے غیر مادی اور غیبی عالم سے تعلق کی بدولت ہی سمجھی جا سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر انسانی زندگی صرف موجودہ مادی عالم ہی سے متعلق ہے' اور اس دنیا میں پیدائش سے پہلے ہمارا کوئی وجود یا تشخص نہ تھا اور نہ ہی موت کے بعد ہمارا کوئی وجود یا تشخص ہو گا' تو پھر واقعہ یہ ہے کہ یہ وجود اور یہ زندگی محض بے مقصد قرار پاتے ہیں۔ سورۂ دخان میں قرآن نے کفار کا قول نقل کیا ہے جو کہتے تھے کہ موت انسانی وجود کا خاتمہ کر دیتی اور موت کے بعد کسی زندگی کا وجود نہیں ہے۔ جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے زمین اور آسمان کو بے مقصد پیدا نہیں کیا اور یہ کہ تمہیں لازماً دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی اور وجود کے بامقصد ہونے کا براہ راست تعلق عالم غیب کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ زندگی اسی وقت بامقصد معلوم ہوتی ہے جب ہم عالم شہود کے علاوہ ایک غیبی عالم کے وجود کا بھی اقرار کریں۔

فاضل مقرر نے بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا کہ مذہب فرد کو اس کے خالق سے قریب کرتا ہے تاکہ وہ موت کے بعد کی زندگی میں فوز و فلاح اور نجات سے ہم کنار ہو سکے۔ دوسری طرف مذہب اجتماعیت کو بھی خدا سے قریب کرتا ہے تاکہ موجودہ زندگی میں امن اور عدل کا قیام ممکن ہو سکے۔ انہوں نے کہا کہ انفرادی سطح پر مذہب کا مقصد آخرت کی فلاح ہے لیکن اجتماعی سطح پر اس کا مقصد اس دنیا کی بھلائی ہے۔ آخرت کی کامیابی فرد کا ذاتی معاملہ ہے لیکن معاشرے میں امن اور عدل کا قیام ایک اجتماعی مسئلہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ فرد کی اخروی کامیابی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ وہ دنیا میں امن اور عدل پر مبنی نظام قائم کرنے کی جدوجہد میں بالفعل حصہ نہیں لیتا۔

اپنے پہلے لیکچر کے دوسرے حصے میں جناب باسط بلال نے مذہب کی موجودہ صورتحال پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے کہا کہ تاریخ انسانی میں ہمیشہ اکثریت نے مذہب اور مذہبی اصولوں کو اہمیت دی ہے' تاہم ہر دور میں ایک باثر اقلیت ایسی موجود رہی ہے جو زوردار آواز میں مذہب اور مذہبی اصولوں کی مخالفت کرتی رہی۔ یہ لوگ ہر دور میں خود کو تعلیم یافتہ' ذہین' اور جدت پسند ہونے کی حیثیت سے پیش کرتے رہے ہیں اور ان کے

نزدیک خدا' رسالت' اور آخرت جیسے عقائد کو کوئی تعلیم یافتہ' ذہین' اور جدت پسند شخص صحیح نہیں مان سکتا۔ گویا ان کے نزدیک صرف جاہل' کم عقل اور دقیانوسی لوگ مذہب اور مذہبی اصولوں کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ مذہب کے ساتھ تحقیر آمیز رویہ اختیار کرنے والی اقلیت ہر دور میں موجود رہی ہے اور مذہب پر "اساطیر الاولین" ہونے کا الزام عائد کرتی رہی ہے۔ جناب باسط بلال نے کہا کہ قرآن کی رو سے ایسے لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے دور میں بھی پائے جاتے تھے جو وحی پر ایمان لانے کو حماقت اور روحی کو "اگلے وقتوں کی کہانیاں" قرار دیتے تھے اور ایسے لوگ نبی کریم ﷺ کے دور میں بھی موجود تھے۔ تاہم آج کے جدید دور میں مذہب کو جہالت کی نشانی سمجھنے والے اقلیت میں نہیں رہے ہیں بلکہ اکثریت بن چکے ہیں۔ یہاں تک "مذہبی" کہلانے والے لوگ بھی غیر شعوری طور پر اسی قسم کے خیالات قبول کر چکے ہیں۔ فاضل مقرر نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ وہ افراد بھی جو ہمارے معاشرے میں مذہب کے علمبردار بلکہ اس کے احیاء کے دعویدار ہیں' اپنے بچوں اور بچیوں کو مذہبی تعلیم کی طرف نہیں بھیجتے۔ ان کے اس عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ بظاہر مذہب کے حامی ہونے کے باوجود ذہنی طور پر وہ بھی مذہب کو دقیانوسیت ہی کی علامت سمجھتے ہیں۔

جناب باسط بلال نے کہا کہ پوری انسانی تاریخ میں' اور ہر معلوم تہذیب میں' مذہب کو فرد اور معاشرے دونوں کے حوالے سے مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ موجودہ دور تاریخ میں ایک غیر معمولی حیثیت کا حامل ہے کہ اس دور میں مذہب کو رد کرنے والوں نے پہلی مرتبہ اکثریت حاصل کر لی ہے' اور مذہبی لوگ جو ہمیشہ سے معاشرے کے اہم ترین اور نمایاں ترین افراد ہوتے تھے' اب اپنا یہ مقام کھو چکے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس عظیم تبدیلی کی تہہ میں کون سے عوامل کار فرما تھے؟

فاضل مقرر نے مذہب سے بے زاری کے دو اسباب کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ اولاً جب سائنسی انداز میں تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ بہت سی ایسی تحریریں اور عقائد جنہیں خدا کی طرف منسوب کیا جاتا تھا' دراصل انسانی ذہن اور انسانی تاریخ ہی کی پیداوار ہیں' اور ثانیاً خود مذہب کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی تاریخ میں مخصوص ادوار آتے

ہیں اور آج تقریباً تمام مذاہب اپنے آخری یعنی موت کے دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ پہلے سبب کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مغربی یورپ میں ۱۸ویں صدی کے اواخر اور ۱۹ویں صدی کے اوائل میں علوم عمرانی کا ارتقاء شروع ہوا تھا' جبکہ سائنس کی ترقی کا سلسلہ پہلے ہی دو صدیوں سے جاری تھا۔ جب مذہب ان علوم عمرانی کی تحقیق و تفتیش کا موضوع بنا تو بہت جلد یہ بات واضح ہونے لگی کہ مذہب کے بہت سے دعوے درست نہیں ہیں' مثال کے طور پر عہد نامہ قدیم پر تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ عام خیال کے برعکس تورات صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی وحی پر مشتمل نہیں ہے' بلکہ اسے درحقیقت پانچ مختلف افراد نے یا پانچ مختلف گروہوں نے کئی سو سال کے عرصے میں لکھا ہے۔ اسی طرح کی تحقیقات کے نتیجے میں بہت سے دیگر مذہبی عقائد' کتابوں' رسومات اور اداروں کے متعلق ثابت ہو گیا کہ انہیں خدا کی طرف منسوب کرنا غلط تھا اور یہ کہ یہ سب اصل میں انسانوں ہی کی پیداوار ہیں۔ ان تحقیقات کے نتائج نے مذہب سے وابستگی کا معاملہ بڑی حد تک کمزور کر دیا۔ اس کے بعد مختلف نظریات ابھرے جنہوں نے مذہب کے آغاز کو خدا کے بجائے انسانی ذہن اور انسانی معاشرے کی پیداوار ثابت کرنے میں کافی کامیابی حاصل کر لی۔ مثلاً کارل مارکس نے مذہب کو معاشی قوتوں کی آویزش کا نتیجہ قرار دیا' سگمنڈ فرائڈ نے مذہب کو انسان کے لاشعور کا شاخسانہ کہا' اور ایمیلی ڈرخائم نے مذہب کو اجتماعی اور عمرانی عوامل کا نتیجہ قرار دیا۔ دوسری طرف وہ دانشور جو مذہب سے مثبت طور پر ہمدردی رکھتے تھے' مذہب کا موثر دفاع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس ضمن میں کارل یونگ اور مرسیا ایلیاڈے کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

مذہب کے زوال کا دوسرا سبب بیان کرتے ہوئے جناب باسط بلال نے کہا کہ اگرچہ اپنی اصل کے اعتبار سے مذہب کا تعلق عالم غیب کے ساتھ ہے' تاہم جب مذہب ہماری اس مادی دنیا میں آتا ہے تو تمام اشیاء کی طرح اس پر بھی بعض فطری قوانین منطبق ہونے لگتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہاں ہر چیز پیدائش' نشوونما' پختگی' زوال اور موت کے مراحل سے گزرتی ہے' چنانچہ مذہب پر بھی یہی تمام مراحل وارد ہوتے ہیں۔ فاضل مقرر

نے تاریخ مذاہب کے ایک نمایاں محقق رابرٹ ایل وڈ کے نظریئے کے حوالے سے کہا کہ ہر مذہب کی تاریخ میں پانچ ادوار آتے ہیں۔ پہلا دور "پیغمبرانہ عہد" (Apostolic Stage) کہلاتا ہے جس میں ایک فرد عالم غیب سے وحی پانے کا دعویٰ لے کر اٹھتا ہے۔ اس دور میں مذہب کے ماننے والے کم ہوتے ہیں اور انہیں ایذا پہنچائی جاتی ہے۔ اس دور میں مذہب ابھی اپنا تشخص قائم کرنے کی کوشش میں ہوتا ہے' کیونکہ اس نئے مذہب کو معاشرے میں پہلے سے موجود مذہب کے مقابلے میں قدم جمانے کے چیلنج کا سامنا ہوتا ہے۔ اسی دور میں مذہب کے بنیادی اصول مرتب و مدون ہوتے ہیں۔ مذہب کی تاریخ کا دوسرا دور "حکمت اور حکومت کا عہد" (Wisdom and Imperial Stage) کہلاتا ہے۔ اس دور میں مذہب ایک غالب قوت کے طور پر قائم ہوتا ہے' اس کے بنیادی اصولوں میں مزید تفصیل کا رنگ پیدا ہوتا ہے' حصول علم کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور مذہب کے دنیاوی پہلو (یعنی قانون اور شریعت) پر توجہات کا ارتکاز ہوتا ہے۔ مذہب کی تاریخ کے تیسرے دور کو "زہد اور روحانیت کا عہد" (Devotional Stage) کہتے ہیں' جس میں یہ احساس شدت اختیار کرنے لگتا ہے کہ قانون پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے اور مذہب کا روحانی اور سری پہلو (esoteric dimension) نظرانداز ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس مرحلے میں زہد' روحانیت اور تصوف توجہات کا مرکز بننے لگتے ہیں۔ مذہب کے آغاز سے اس عہد کے اختتام تک اتنا وقت گزر چکا ہوتا ہے کہ مذہب کی تعلیمات پر بہت سے بیرونی نظریات اپنے اثرات کرنے لگتے ہیں اور یہ تعلیمات اپنی اصل حالت میں برقرار نہیں رہتیں۔ اس موقع پر مذہب "تجدید و اصلاح کے عہد" (Reformation Stage) میں داخل ہوتا ہے جس میں مذہب کی اصل اور خالص تعلیمات کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بالآخر یہ عہد بھی ختم ہو جاتا ہے اور مذہب اپنے آخری مرحلے میں داخل ہوتا ہے جسے "لوک کہانیوں کا عہد" (Folkloric Stage) کہتے ہیں۔ اس دور میں مذہب کے پیروکاروں کے پاس محض چند قصے اور کہانیاں رہ جاتی ہیں جن کے مفہوم سے وہ بالکل واقف نہیں ہوتے ہیں۔ مذہب اس دور میں چند رسومات کا مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے جن پر

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

پروفیسر حافظ احمد یار

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ

آیات ۱۰۲ - ۱۰۳

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کیلئے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغہ 'الاعراب' الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی علی الترتیب اللغہ کیلئے ۱' الاعراب کیلئے ۲' الرسم کیلئے ۳' اور الضبط کیلئے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغہ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لئے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لئے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغہ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھٰکذا۔

۲ : ۶۲

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ

اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۚ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۚ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۚ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝

۲ : ۶۲ : ۱ اللّغة

[وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ]

① "وَاتَّبَعُوا" (اور اُنہوں نے پیروی کی / وہ پیچھے لگ گئے)۔ اس میں ابتدائی "و" تو عاطفہ بمعنی "اور" ہے اور "اِتَّبَعُوا" کا مادہ "ت ب ع" اور وزن "اِفْتَعَلُوا" ہے۔ اِس مادہ سے فعل مجرد (تبِع یتبَع - پیچھے چلنا' پیرو ہونا) کے باب' معنیٰ اور استعمال وغیرہ پر البقرہ: ۳۸ [۲ : ۲۷ : ۱ (۹)] میں بات ہوئی تھی۔

● زیر مطالعہ لفظ (اِتَّبَعُوا) اِسی مادہ سے بابِ افتعال کا صیغہ ماضی معروف (جمع مذکر غائب) ہے۔ باب افتعال کے اس فعل "اِتَّبَعَ ..... یَتَّبِعُ اِتِّبَاعًا" کے معنی ہیں "..... کی پیروی کرنا'..... کا پیرو ہونا'..... کے پیچھے لگ لینا'... کے پیچھے ہو لینا'. کے پیچھے لگ جانا" وغیرہ۔ یہ فعل متعدی ہے اور (اپنے فعل مجرد کی طرح) اس کا مفعول بھی ساتھ ہی بنفسہٖ آتا ہے اور عموماً مذکور ہوتا ہے (یعنی محذوف نہیں ہوتا)۔ قرآنِ کریم میں اس باب (افتعال) سے اس فعل کے مختلف صیغے ۱۳۶ جگہ آئے ہیں اور صرف ایک جگہ (البقرہ: ۱۶۶) میں مفعول غیر مذکور (محذوف) ہے۔ اس کے علاوہ اس سے اسم مفعول کا ایک ہی صیغہ (جمع مذکر سالم) دو جگہ آیا ہے۔

② "مَا" (اس چیز کی جو کہ' اس کی جو) - "مَا" موصولہ کے لئے دیکھئے [۲ : ۲ : ۱ (۵)]

③ "تَتْلُوْ" (پڑھتی ہے / پڑھتے ہیں)۔ مجرد فعل کے اس صیغے (جس کے "رسم" کی بحث آگے آئے گی) کا مادہ "ت ل و" ہے اور وزن "تَفْعُلُ" ہے۔ اس کے فعل مجرد (تَلَا یَتْلُو یعنی تَلَوَ یَتْلُوُ = پیچھے آنا۔ تلاوت کرنا) کے معنی اور استعمال وغیرہ پر البقرہ: ۴۴ [۲ : ۲۹ : ۱ (۹)] میں کلمہ "تَتْلُوْنَ" کے ضمن میں بات ہوئی تھی — یہ صیغہ (تَتْلُوْ) دراصل تو واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے کیونکہ آگے اس کا فاعل (شیاطین) جمع مکسر آرہا ہے اِس لئے اُردو میں اِس کا ترجمہ بصورت مذکر "پڑھتے ہیں" کیا جائے گا---- نیز یہ

صیغہ تو مضارع کا ہے جو حال اور مستقبل کے لئے آتا ہے مگر زیرِ مطالعہ عبارت میں یہ یہودیوں کی (ماضی اور حال کی) حالت بیان کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے اور اس سے پہلے "اتَّبَعُوا" کا صیغہ ماضی بھی آیا ہے' لہٰذا یہاں یہ "تَتْلُوْ" ایک طرح سے "کَانَتْ تَتْلُوْ" کے مفہوم میں ہے اِس لئے اِس کا ترجمہ بصیغہ ماضی استمراری "پڑھا کرتے تھے' پڑھتے تھے" کرنا موزوں ہے۔ بعض نے "پڑھنے پڑھانے" کے مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے اِس کا ترجمہ "چرچا کرتے تھے" کیا ہے۔

④ "الشَّيٰطِيْنُ" یہ لفظ اِسی طرح (بصیغہ جمع مگر مضاف) البقرہ : ۱۴[۲:۱۱:۱(۴)] میں ("شَيٰطِيْنِهِمْ" کی شکل میں) گزر چکا ہے اور اِس کے مادہ وغیرہ کے بارے میں بحث "استعاذہ" میں اور پھر دوبارہ البقرہ : ۳۶[۲ : ۲۲ : ۱(۱)] میں بسلسلہ کلمہ "الشیطٰن" گزر چکی ہے۔ اِس کے معنی (خصوصاً بصیغہ جمع ہو تو) "تمام سرکش اور شیطان صفت جن اور انسان" ہوتے ہیں۔ اِسی لئے اُردو میں اس کا ترجمہ "شیطانوں" ہی کر لیا جاتا ہے۔ اس کے اسم پر بات آگے ہو گی۔

⑤ "عَلٰى" اس حرف الجر کے معانی (پر' اُوپر وغیرہ) اور استعمال پر الفاتحہ : ۷[۱:۶:۱ (۳)] میں بات ہوئی تھی --- یہ (علٰی) کبھی کبھی بعض دوسرے حروف الجر (مثلاً بِ عَنْ 'فِی 'لِ 'مَعَ اور مِنْ) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔{۱} زیرِ مطالعہ عبارت میں یہ "فِی" کے معنی میں آیا ہے یعنی "فِی مُلْكِ سُلَيْمَان" یا "فِی زَمَنِ مُلْكِ سُلَيْمَان" اس کا یہی استعمال (فِی والا) القصص :۱۵ میں بھی آیا ہے۔

⑥ "مُلْكِ سُلَيْمٰنَ" اِس کا ترجمہ تو ہے "سلیمان کی حکومت یا بادشاہت یا سلطنت" اور مراد ہے "ان کا عہدِ حکومت" یا "ان کی حکمرانی کا زمانہ"۔ کلمہ "مُلْكٌ" کے مادہ اور اس سے فعل مجرد کے معنی وغیرہ الفاتحہ : ۴[۱ : ۳ : ۱(۱)] کلمہ "مَالِكِ" کے ضمن میں بیان ہو چکے ہیں اور "مَلَكَ يَمْلِكُ" کے ایک معنی "حاکم ہونا' حکمران ہونا" بھی ہیں اور اِسی سے "مَلِكٌ" بمعنی "بادشاہ" استعمال ہوتا ہے --- لفظ "مُلْكٌ" (بمعنی بادشاہی' حکومت' حکمرانی) قرآنِ کریم میں مفرد مرکب معرفہ نکرہ صورتوں میں پچاس کے قریب مقامات پر آیا ہے۔

● زیرِ مطالعہ مرکب (اضافی) کا دوسرا لفظ "سُلَيْمَان" (جس کے قرآنی رسم پر آگے بات ہو گی) بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے ایک مشہور نبی کا نام ہے اِسی لئے یہ لفظ غیر

{۱} دیکھئے "تناوب حروف الجر" للدکتور محمد حسن عواد (الاردن) ص ۹۷ تا ۱۰۲

منصرف ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک عظیم سلطنت کے حکمران بھی تھے بلکہ ان کا عہد (۹۷۰ تا ۹۳۵ قبل مسیح) بنی اسرائیل کی تاریخ کا "سنہری زمانہ" شمار ہوتا ہے۔ قرآن کریم کے مطابق وہ نبی بھی تھے۔ جبکہ یہودی ان کو صرف ایک عظیم الشان یہودی حکمران سمجھتے ہیں اور وہ اِن کے عہد کے بارے میں جادُو وغیرہ کی خرافات میں مبتلا ہو گئے تھے (اور یہ خرافات مسلمانوں میں بھی راہ پاگئی ہیں) جس کی طرف آیت زیر مطالعہ میں اشارہ ہے۔

۲ : ۶۲ : ۱(۲) [وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا]

① "وَمَا" (اور نہیں) "وَ" عاطفہ اور "مَا" نافیہ ہے۔ دیکھئے [۲ : ۲ : ۱(۵)]

② "كَفَرَ" (کفر کیا) فعل "كَفَرَ يَكْفُرُ" کے لئے دیکھئے [۲ : ۵ : ۱(۱)] میں کلمہ "كَفَرُوْا"۔

③ "سُلَيْمٰنُ" یعنی سلیمان علیہ السلام نے (کفر نہیں کیا تھا)

④ "وَلٰكِنَّ" (لیکن' بلکہ 'مگر) "لٰكِنَّ" حرفِ مشبہ بالفعل کیلئے دیکھئے [۲ : ۹ : ۱(۸)]

⑤ "الشَّيٰطِيْنَ" (شیطانوں نے) اِس پر بحث ابھی اوپر گزری ہے۔

⑥ "كَفَرُوْا" (اُنہوں نے کفر کیا) سیاقِ عبارت (بیان قصہ) کی مناسبت سے یہاں اس کا ترجمہ "کفر کرتے تھے" کرنا موزوں ہے۔

● یوں پوری عبارت کا ترجمہ بنا "سلیمان نے کفر نہیں کیا بلکہ کفر تو شیطانوں نے کیا" ----- قرآن کو یہ تردید اِس لئے کرنی پڑی کہ جاہل یہودیوں نے ایسی باتیں (جن کا آگے ذکر آرہا ہے) حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کردی تھیں۔

۲ : ۶۲ : ۱(۳) [يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ]

① "يُعَلِّمُوْنَ" (وہ سکھاتے ہیں۔) اس صیغہ فعل کا مادہ "ع ل م" اور وزن "يُفَعِّلُوْنَ" ہے۔ باب تفعیل کے اِس فعل "عَلَّمَ يُعَلِّمُ" (سکھانا) کے معنی وغیرہ البقرہ :۳۱ [۲ : ۲۲ : ۱(۱)] میں کلمہ "عَلَّمَ" میں بیان ہو چکے ہیں۔ بیانِ قصہ کی بناء پر یہاں اس کا ترجمہ "سکھاتے تھے" کیا جاسکتا ہے۔

② "النَّاسَ" (لوگوں کو) اِس لفظ (الناس) کے مادہ اور اشتقاق وغیرہ پر مفصل بحث البقرہ :۸ [۲ : ۷ : ۱(۳)] میں دیکھئے۔

③ "السِّحْرَ" (جادو) یہ لفظ یہاں پہلی دفعہ آیا ہے۔ اِس کا مادہ "س ح ر" اور وزن (لام تعریف کے بغیر) "فِعْلٌ" ہے۔ اِس مادہ سے فعل مجرد زیادہ تر "سحَر.....

یسحَر سِحرًا" (فتح سے) آتا ہے اور اِس کے مشہور معنی "...... پر جادو کر دینا" ہیں۔ یہ فعل متعدی ہے اور اس کا مفعول بنفسہٖ (ساتھ) آتا ہے اور اِس کا اصل مفہوم "کسی چیز کو اس کی اصل حقیقت کی بجائے کسی دوسرے روپ میں دکھانا" ہے یعنی "کسی کی نظر بندی کر دکھانا" مثلاً کہتے ہیں "سحَر الشیئَ عَن وَجهِہٖ" (اس نے اسے وہ چیز اصل کی بجائے کچھ اور کر دکھائی یا چیز کی اصل حقیقت کو اس سے پھیر دیا' ہٹا دیا) پھر اِسی سے فعل میں دھوکا دینا کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ "سحَر فلانًا بِالشیئِ" کے معنی ہیں "خَدَعَہٗ" یعنی "اس نے فلاں کو اس چیز کے ذریعے دھوکا دیا" ---- اور اس کے ایک معنی "کسی کے دل و دماغ پر مسلط ہونا یعنی اس کے دل و دماغ پر ایسا قابو پانا کہ گویا وہ اس میں رہے ہی نہیں" بھی ہیں یعنی "سلَبَ لُبَّہٗ" (اس نے اس کی عقل چھین لی) گویا "اس پر جادو کا سا اثر کر دیا" ---- اسی سے کہتے ہیں: "سحَرہ بکلامِہٖ" (اس نے اس پر اپنی باتوں سے جادو کا سا اثر کیا) یا "سحَرَتہُ بِعَینِھا" (اس عورت نے اپنی آنکھ سے اس کی مت مار دی)۔ عربی میں چاندی پر سونے کا ملمع کرنے کے لئے یہ فعل بھی استعمال ہوتا ہے یعنی "سحَر الفِضّۃَ" کے معنی ہیں "چاندی پر سونے کا رنگ چڑھا دیا"۔ الغرض اِن تمام افعال میں مشترک معنی "کسی کے دل و دماغ پر شدید اثر ڈالنا" ہیں چاہے وہ اچھا ہو یا بُرا۔ اسی فعل کے ایک معنی "کسی کے پھیپھڑوں (یعنی سینے یا چھاتی) میں کوئی چیز مار دینا" بھی ہوتے ہیں۔ عربی میں پھیپھڑے کو "رِئَۃ" بھی کہتے ہیں اور "سُحْرَۃ" بھی --- اور صاحب المفردات نے ان معنی کی "جادو کرنا" سے مناسبت بتائی ہے (یعنی کسی کے دل (خیالات یا صحت) پر بُری طرح اثر انداز ہونا) اور اسی فعل کے ایک معنی "کسی چیز کو بگاڑ کے رکھ دینا" بھی ہیں۔ "جادو کرنا" میں یہ مفہوم بھی موجود ہے۔ باب سمع (سحِر یسحَر) سے اِس کے معنی "صبح سویرے کام میں لگنا" بھی ہوتے ہیں۔ اِس کا مصدر "سَحَرٌ" (صبح ہونا) ہے (بفتح السین والحاء)

● قرآنِ کریم میں اس فعل مجرد سے تین صیغے تین ہی جگہ آئے ہیں اور ہر جگہ یہ "جادو کر دینا" یا "مت مار دینا ---- اور ہٹا دینا" (یعنی اَفِکَ" اور "صَرَفَ") کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ خصوصاً المومنون: ۸۹ میں تو یہ مؤخر الذکر معنی میں ہی استعمال ہوا ہے جس کا ذکر اپنی جگہ آئے گا۔ فعل مجرد کے تین صیغوں کے علاوہ اس مادہ سے مجرد اور مزید فیہ کے بعض مشتقات اور ماخوذ کلمات (سِحرٌ۔ سَاحِرٌ۔ مُسَحَّرِین۔ سَحّار۔ سَحَرَۃ۔ سَحَرٌ۔ اَسحَار۔ مَسحُور وغیرہ) ساٹھ کے قریب مقامات پر آئے ہیں۔

ان سب پر حسب موقع بات ہوگی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

● زیر مطالعہ لفظ (السِحر) اِس فعل کا ایک مصدر ہے اور فعل کے مذکورہ بالا معانی کی روشنی میں اس لفظ کے معنی "جادو' جاذبِ دل و دماغ چیز (سچ ہو یا جھوٹ)' دھوکا یا دھوکے کی بات' جادو بیانی اور جھوٹ" کی صورت میں بیان ہوئے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ لفظ معرفہ نکرہ مفرد مرکب صورتوں میں ۲۸ جگہ آیا ہے اور حسب موقع مندرجہ بالا معانی میں سے کوئی ایک مراد لیا جاسکتا ہے۔

● زیر مطالعہ مقام پر یہ "جادو" ہی کے معنی میں آیا ہے' کیونکہ اگلی (آنے والی) عبارت میں اس کی جو کیفیت بیان ہوئی ہے وہ ان ہی معنی کی تائید کرتی ہے---- صاحب المفردات نے جادو (سِحر) کی تین اقسام یا اس کے (عام استعمال ہونے والے) تین مفہوم بیان کئے ہیں۔

① محض ہاتھ کی صفائی یا نظر کا دھوکا (نظربندی)۔ اس لحاظ سے یہ "شعبدہ بازی" کے معنی رکھتا ہے۔ "شعبدہ" اور "معجزہ" میں یہی فرق ہے کہ "شعبدہ" میں چیز کی اصلی حقیقت تو وہی رہتی ہے صرف دیکھنے والے کو ایک دوسرا روپ نظر آتا ہے جب کہ "معجزہ" میں چیز کی اصل حقیقت ہی بدل جاتی ہے۔ فرعون کے جادوگر اپنی شعبدہ بازی اور نظربندی کے مقابلے پر موسیٰ علیہ السلام کے "معجزہ" میں یہی فرق سمجھ کر ہی "ہم ایمان لائے" پکار اُٹھے تھے۔

② "سِحر" کی دوسری قسم یہ ہے کہ بعض خاص قسم کے شیطانی عملیات اور منتروں سے کسی کی صحت' کاروبار یا اس کے خیالات (مثلاً بغض و محبت) پر اثر انداز ہوا جائے جسے عرفِ عام میں "کالا علم" بھی کہتے ہیں۔ اس میں شیطان اور بعض شیطانی قوتوں سے مدد لی جاتی ہے۔ رہے عملیات اور منتروں کی تاثیر تو یہ بہرحال ایک حقیقت ہے جس کا مشاہدہ اتنے لوگوں نے کیا ہے کہ ان سب کا جھوٹ پر اتفاق ناممکن ہے۔ تاہم (جیسا کہ اسی آیت میں آگے آرہا ہے) یہ کام دین و ایمان کو برباد کرنے والا ہے۔ مادی دنیا میں اس کی مثال "رشوت" کی دی جاسکتی ہے جس سے کئی مشکل کام کئے اور کرائے جاسکتے ہیں مگر انجام دونوں رشوت دینے اور لینے والے---- کا جہنم کی آگ ہے۔

● آیت زیر مطالعہ میں یہودیوں کے اسی "علم" کے گرویدہ ہونے کا ذکر ہے۔ قرآنِ کریم نے اس "علم" کو نہ تو صاف الفاظ میں مطلقاً خرافات اور بے حقیقت قرار دیا ہے اور نہ ہی اسے "مؤثر بذاتہٖ" (خود کار تاثیر رکھنے والا) کہا ہے۔ جیسا کہ ہندوؤں'

یہودیوں اور بعض دوسری اقوام کا خیال ہے۔ بلکہ اصل نفع و نقصان کا مالک "اللہ تعالیٰ" ہی کو قرار دیا ہے۔ مزید برآں اس "علم" کے "برباد کنندۂ آخرت" ہونے کو وضاحت اور تاکید سے بیان کیا ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

③ سِحْر یا جادو کی تیسری قسم وہ ہے جس کا تصور بعض عجمی (غیر عرب) لوگوں میں پایا جاتا ہے (اور عوامی کہانیوں میں اس کا ذکر ہوتا ہے) کہ بعض لوگ "جادو" کے زور سے کسی انسان کو کسی اور صورت (مثلاً مکھی یا گدھے) میں بدل دیتے ہیں۔ صاحب المفردات لکھتے ہیں کہ اہل علم و دانش کے نزدیک جادو کا یہ تصور بالکل از قسمِ خرافات ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

● بہرحال زیر مطالعہ عبارت (يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ) کا ترجمہ تو بنتا ہے "وہ سکھاتے ہیں لوگوں کو جادو" جسے بعض نے "سحر کی تعلیم دیتے تھے" کی صورت دی ہے۔ لفظ "سِحْر" اُردو میں بھی مستعمل ہے اور اس سے مراد عملیات' منتروں اور ٹوٹکے یا "کالا علم" ہی لیا جا سکتا ہے کیونکہ یہاں بظاہر مندرجہ بالا پہلی قسم (شعبدہ بازی) یا تیسری قسم (طلسمات) کی تعلیم دینا مراد نہیں ہے۔

۲ : ۶۲ : ۱(۴) [وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ]

اِس عبارت میں مشکل الفاظ تو صرف تین عجمی اسماء ہیں۔

① "وَمَا" (اور وہ جو کہ) اس کا ترجمہ یہاں دو طرح سے ہو سکتا ہے جس کی وجہ ترکیب نحوی کا فرق ہے۔ اس پر مزید بات "الاعراب" میں ہوگی۔

② "أُنْزِلَ" (اُتارا گیا) باب افعال کے اس فعل (جس کا یہ ماضی مجہول صیغہ واحد مذکر غائب ہے) کے معنی وغیرہ کے لئے البقرہ : ۴ [۲ : ۳ : ۱(۲)] میں یہی لفظ (اُنْزِلَ) دیکھئے۔

③ "عَلَى الْمَلَكَيْنِ" (دو فرشتوں پر) ---- "عَلٰى" تو معروف حرف الجر ہے جس کے استعمالات پر الفاتحہ : ۷ [۱ : ۶ : ۱(۳)] میں بات ہوئی تھی ----- اور "الْمَلَكَيْنِ" لفظ "المَلَكْ" کا تثنیہ مجرور ہے۔ اس لفظ (ملَکْ بمعنی فرشتہ) کے مادہ و اشتقاق وغیرہ کی مفصل بحث البقرہ : ۳ [۲ : ۲۱ : ۱(۲)] میں کلمہ "المَلَائِكَة" کے ضمن میں ہوئی تھی۔

④ "بِبَابِلَ" کی ابتدائی "بِ" (باء) تو حرف الجر ہے جو یہاں "فِی" (میں) کے معنیٰ

میں آیا ہے اور "بَابِل" جنوبی عراق کے ایک قدیم شہر کا نام ہے جس کے کھنڈرات دریائے فرات کے مشرقی کنارے کے قریب پائے جاتے ہیں۔ عجمی ہونے کے باعث یہ ایک غیر منصرف اسم ہے۔ اسے انگریزی میں "Babylon" کہتے ہیں۔ اور یہودیوں کی تاریخ سے اس کا خاص تعلق ہے جسے یہودیوں کی "اسیریٔ بابل" کا زمانہ ——— (Babylonian Captivty) کہتے ہیں۔

⑤ "هَارُوتَ وَمَارُوتَ" یہ بھی دو نام ہیں جو عجمی ہونے کے باعث غیر منصرف بھی ہیں ---- بظاہر یہاں یہ "بابل والے دو فرشتوں" کے نام کے طور پر آئے ہیں جسے بعض مفسرین نے "رمزیہ" (Symbolic) قرار دیتے ہوئے فرشتہ سیرت (نیک) انسانوں کے نام سمجھا ہے۔ بہرحال اِس حصۂ آیت کا ترجمہ بنا "اور وہ جو اُتارا گیا بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت (نامی) پر" بعض نے "اُتارا/نازل کیا گیا" کی بجائے "(جو) اُترا" سے ترجمہ کیا ہے جو محاورے اور مفہوم کے لحاظ سے ہی درست کہا جا سکتا ہے ورنہ بظاہر تو یہ "اُنْزِلَ" کی بجائے "نَزَلَ" کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے --- اِس ترجمے کے بعض دوسرے پہلوؤں پر حصہ "الاعراب" میں بات ہوگی۔

۲ : ۶۲ : ۱(۵) [وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَا...]

عبارت میں کوئی نیا لفظ نہیں ہے۔ کلمات کا ترجمہ مع گزشتہ حوالہ درج ذیل ہے۔

① "وَمَا" (اور نہیں) یہاں "مَا" نافیہ ہے دیکھئے البقرہ: ۳[۲:۲:۱(۵)]

② "يُعَلِّمَانِ" (وہ دونوں سکھاتے ہیں) اس کا ترجمہ اوپر والے "اور نہیں" سے ملا کر ہوگا یعنی "وہ دونوں نہیں سکھاتے"۔ یہ صیغہ فعل (جس کے رسم قرآنی پر آگے "الرسم" میں بات ہوگی) فعل "عَلَّمَ يُعَلِّمُ" ۔ (سکھانا' تعلیم دینا) سے مضارع معروف کا صیغہ تثنیہ مذکر غائب ہے۔ مزید دیکھئے البقرہ: ۳۱[۲:۲۲:۱(۱)] میں۔

③ "مِنْ اَحَدٍ" (کسی ایک کو بھی) کلمہ "مِنْ" کے استعمالات کے لئے دیکھئے البقرہ: ۳[۲:۲:۱(۵)] اور "اَحَد" (ایک) کے مادہ و اشتقاق کے علاوہ اس کے مثبت منفی طریق استعمال پر البقرہ: ۹۶[۲:۵۹:۱(۵)] میں مفصل بات ہوئی تھی۔ یہاں لفظی ترجمہ تو بنتا ہے "کسی ایک بھی میں سے کو"۔ یہاں "کو" کیوں لگا ہے اس پر حصہ "الاعراب" میں بات ہوگی۔

④ "حَتّٰى" (یہاں تک کہ۔ جب تک کہ نہ....) اس حرف کے ناصب اور جار ہونے

کے لحاظ سے استعمال پر البقرہ :۵۵[۲ :۳۵ :۱(۲)] میں مفصل بات ہوئی۔ اُردو میں اگر اس کا ترجمہ "یہاں تک کہ..." سے کیا جائے تو بعد والے جملے (یا فعل) کا ترجمہ "مثبت" فعل کے ساتھ ہوتا ہے اور اگر "جب تک کہ...." سے ترجمہ کریں تو اُردو میں ترجمہ "منفی" فعل کے ساتھ ہوگا، چاہے عربی میں اِس کے بعد "مثبت" فعل بھی ہو۔ جیسا کہ اگلے فعل سے ظاہر ہوگا۔

⑤ "یَقُوْلَا" (....وہ دونوں کہتے ہیں یا (جب تک) وہ دونوں کہہ نہیں لیتے) فعل "قَالَ یَقُوْلُ = کہنا" (جس سے "یَقُوْلَا" فعل مضارع منصوب صیغہ تثنیہ مذکر غائب ہے) کی لغوی بحث البقرہ :۸[۲ :۷ :۱(۵)] میں گزر چکی ہے۔

● یوں اس حصہ آیت کا ترجمہ بنتا ہے "اور وہ دونوں نہیں سکھاتے کسی ایک کو بھی جب تک کہ وہ دونوں کہہ نہیں لیتے"----بیانِ قصہ کی بناء پر یہاں بھی مضارع کا ترجمہ (کَانَا یُعَلِّمَانِ کی طرح) فعل ماضی سے کرنا درست ہے، یعنی "نہیں سکھاتے تھے / سکھلاتے تھے" بعض نے محاورہ کی بنا پر "سکھانے" کی بجائے "بتاتے" یا "بتلاتے" سے ترجمہ کیا ہے کیونکہ اس میں "خفیہ" راز داری کی بات کا مفہوم ہے۔ اسی طرح بیشتر حضرات نے "مِنْ اَحَدٍ" کا ترجمہ صرف "کسی کو" ہی کر دیا ہے۔ اس میں "مِنْ" والا زور نہیں ہے۔ صرف ایک دو نے "کسی کو بھی" سے ترجمہ کیا ہے جو زیادہ موزوں ہے۔ اکثر نے یہاں "حَتّٰی" کا ترجمہ "جب تک کہ نہ...." سے کرتے ہوئے "یَقُوْلَا" کا ترجمہ "کہہ دیتے تھے، کہہ لیتے" سے کیا ہے اور چونکہ یہاں "حَتّٰی" کے بعد ایک "اَنْ" (کہ۔ یہ کہ) مقدّر ہے اس لئے ترجمہ "یہ نہ کہہ دیتے، یہ نہ کہہ لیتے" سے کیا گیا ہے۔ یہ عبارت نامکمل جملہ ہے کیونکہ "یَقُوْلَا" کا مفعول (مقول) ابھی بیان نہیں ہوا جو آگے بیان ہو رہا ہے۔

۲ : ۶۲ : ۱(۶) [....اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ]

اِس جملہ میں نیا لفظ "فِتنة" ہے جس کی لغوی وضاحت کی ضرورت ہوگی۔ باقی کلمات کا صرف اُردو ترجمہ اور گزشتہ حوالہ لکھنا کافی ہوگا۔

① "....اِنَّمَا نَحْنُ" (سوائے اس کے نہیں کہ ہم۔ ہم تو صرف۔ ہم تو بس) "نَحْنُ" تو جمع متکلم کی ضمیر مرفوع بمعنی "ہم" ہے۔ "اِنَّمَا" (جو حرفِ مشبہ بالفعل "اِنَّ" اور "مَا" کافّہ کا مرکب ہے) اس کے معنی اور استعمال پر سب سے پہلے البقرہ : ۱۱

[۲:۹:۱(۵)] میں مفصل بات ہوئی تھی۔

② "فِتْنَة" اس لفظ کا مادہ "ف ت ن" اور وزن "فِعْلَةٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "فَتَنَ ..... یفتِن فَتْنًا وَ فِتْنَةً وَ فُتُونًا وَ مَفْتُونًا" (ضَرَب سے) آتا ہے۔ آخری تین مصدر قرآنِ کریم میں آئے ہیں پہلا نہیں آیا۔ (۱) اس کے بنیادی معنی ہیں "..... کو پرکھنا' کا امتحان لینا' کو آزمانا" اور اس کی اصل "سونے (چاندی وغیرہ) کو آگ پر پگھلا کر اس کے عمدہ یا خراب ہونے کا پتہ چلانا" ہے۔ مثلاً کہتے ہیں "فَتَنَ الصائغُ الذّھبَ" (سنار نے سونے کو پرکھنے کے لئے پگھلایا) اور اسی سے اس کے ایک معنی "آگ پر رکھنا یا آگ میں جلانا" بھی ہیں۔ قرآنِ کریم میں ہے "ھُمْ عَلَی النَّارِ یُفْتَنُونَ" (الذاریات: ۱۳) یعنی وہ آگ میں جلائے جائیں گے۔ (۲) اور اسی سے اس میں "کسی کو مصیبت یا تکلیف میں ڈالنا" کے معنی بھی پیدا ہوتے ہیں جیسے "فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ" (البروج: ۱۰) میں ہے یعنی "انہوں نے اہل ایمان مَردوں اور عورتوں کو اذیت میں ڈالا" (۳) اور اسی لئے اس فعل کے ایک معنی "..... کو لبھا لینا" بھی ہوتے ہیں" مثلاً کہتے ہیں "فَتَنَتْهُ المَرْأَةُ" عورت نے اس کو لبھا لیا یعنی آزمائش یا مصیبت میں ڈال دیا۔ قرآنِ کریم میں ان معنی میں فعل کا صیغہ تو کوئی نہیں آیا مگر لفظ "فتنة" (دل کو بہت پسند آنے والی شے کے معنی میں) متعدد جگہ استعمال ہوا ہے۔ بعض کتبِ لغت (مثلاً القاموس' البستان' المنجد' اللسان) میں لکھا ہے کہ "فَتَنَ" لازم و متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے یعنی "فَتَنَ الرَّجُل فلانًا ففَتَن" کے معنی ہیں "آدمی نے فلاں کو آزمائش یا مصیبت میں ڈالا اور وہ (اس میں) پڑ گیا" یا مثلاً "فتَن الرّجلُ بالمرأةِ" (آدمی عورت کی وجہ سے فتنہ میں پڑا)۔ اگرچہ اللسان میں اسے کمزور استعمال کہا گیا ہے۔ دوسرے معنی (فتنہ میں پڑنا) کے لئے اس کا صیغہ مجہول ہی استعمال ہوا ہے۔ اس فعل کا مفعول ہمیشہ بنفسہٖ آتا ہے۔ قرآنِ کریم میں جہاں بھی یہ فعل آیا ہے اس کا مفعول ساتھ مذکور ہوا ہے اور جس چیز کے ذریعے کسی چیز کو آزمائش میں ڈالا جائے اور پرکھا جائے اس پر "بِ" کا صلہ بھی آتا ہے اور "فِی" کا بھی۔ جیسے قرآنِ کریم میں ہے "فُتِنْتُم بِہٖ" (طٰہٰ: ۹۰) یعنی "تم اس کے ذریعے آزمائش میں ڈالے گئے" اور "لِنَفْتِنَهُمْ فِیهِ" (طٰہٰ: ۱۳۱' الجن: ۱۷) یعنی "تاکہ ہم ان کو اس میں یا اس کے ذریعے آزمائیں)۔ بعض دفعہ یہ فعل "بہکانا" کے معنی میں آتا ہے (کہ یہ بھی آزمائش یا مصیبت کی ایک شکل ہے) اس صورت میں اس کے دوسرے مفعول (جس سے بہکا دیا

جائے) پر "عَن" کا صلہ آتا ہے۔ یہ استعمال بھی قرآنِ کریم میں دو جگہ آیا ہے "....اَنْ یَفْتِنُوکَ عَنْ بَعْضِ مَا....." (المائدہ : ۴۹) اور "لَیَفْتِنُونَکَ عَنِ الَّذِی...." (الاسراء : ۷۳) ـــــ ان کے علاوہ اس فعل کے بعض اور استعمالات بھی ہیں جو قرآنِ کریم میں نہیں آئے۔

● الغرض اس فعل کے بنیادی معنی (آزمائش میں ڈالنا) اس کے تمام استعمالات پر مشترک نظر آتے ہیں' اگرچہ اس کا ترجمہ بعض دفعہ "مصیبت میں ڈالنا' ایذاء پہنچانا' حملہ آور ہونا' سزا دینا' بھٹکا دینا" کی صورت میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس فعل مجرد (فتَن یفتِن) سے ماضی اور مضارع کے معروف اور مجہول مختلف صیغے ۲۳ جگہ آئے ہیں۔ اس سے مزید فیہ کے افعال اگرچہ عام عربی میں آتے ہیں تاہم قرآنِ کریم میں ایسا کوئی فعل نہیں آیا۔ اور اس مادہ سے مشتق اور ماخوذ مختلف کلمات (مثلاً فِتنَة' مَفتُون' فَاتِنِین وغیرہ) تیس سے زائد مقامات پر آئے ہیں جن پر حسب موقع بات ہو گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

● زیر مطالعہ لفظ "فِتْنَةٌ" (جو اس فعل کا ایک مصدر بھی ہے) کے بنیادی معنی "آزمائش اور امتحان" ہی ہیں لیکن سیاق و سباقِ عبارت کے لحاظ سے اس کا ترجمہ "ابتلاء' ایذاء' تکالیف' گمراہی' دھوکہ' فساد' جھگڑا' اختلاف' فتنہ انگیزی' خانہ جنگی' حجت' معذرت' تختہ مشق (بننا)' جنون' دشمن اور زینت" سے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً مال اور اولاد کو قرآنِ کریم میں ایک جگہ "زِینَة" دوسری جگہ "فِتنَة" اور تیسری جگہ "عَدُوّ" بھی کہا گیا ہے۔ ان معانی کا آپس میں تعلق ظاہر ہے۔

(۳) "فَلَاتَکْفُرْ" (سو تو کفر نہ کر۔ ایمان نہ کھو)۔ فعل "کَفَر یکفُر" اب تک کئی دفعہ آ چکا ہے۔ زیر مطالعہ صیغہ "لَاتَکْفُرْ" (ابتدائی "فَ" تو عاطفہ سببیہ ہے) اس فعل سے صیغہ نہی بروزن "لَاتَفْعُلْ" ہے۔ مزید دیکھئے البقرہ۶ [۲ : ۵ :۱(۱)]

● یوں اس عبارت (اِنَّمَا نَحنُ فِتنَةٌ فَلَاتَکْفُرْ) کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "........ (کہ) سوائے اس کے نہیں کہ ہم آزمائش ہیں سو تو کفر نہ کر" ـــــ جیسا کہ "مفردات" میں بیان ہوا ہے۔ اکثر حضرات نے "اِنَّمَا" کا ترجمہ "تو' بس' صرف' نری" کے ساتھ کیا ہے یعنی (نَحنُ سمیت) "ہم تو' ہم تو نری' ہم تو بس" کی صورت میں ترجمہ کیا گیا ہے جو اُردو محاورے کا تقاضا ہے۔ "فَلَاتَکْفُرْ" کا ترجمہ "سو تو کافر مت ہو' کہیں کافر نہ بن

جائیو' تو اپنا ایمان نہ کھو' تم کفر میں نہ پڑو' تم کفر اختیار نہ کر لینا" سے بھی کیا گیا ہے' سب کا مفہوم یکساں ہے۔ البتہ بعض تراجم میں تاکید کا پہلو زیادہ ہے۔ "فِتْنَةٌ" کا ترجمہ یہاں "آزمائش" کے علاوہ "امتحان' آزمانے کو' آزمائش کے لئے" کی صورت میں کیا گیا ہے۔ بعض نے "ذریعۂ آزمائش و امتحان" سے ترجمہ کیا ہے۔ اصل عربی میں "ذریعہ" کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے۔

(جاری ہے)

بقیہ : دور حاضر میں مذہب سے بیزاری

خاندان یا برادری کی سطح پر عمل کیا جاتا ہے' لیکن مذہب کا مجموعی طور پر معاشرے یا تہذیب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اس دور کو مذہب کی موت سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

جناب باسط بلال نے کہا کہ آج ایک کے سوا تمام مذاہب اپنی اپنی تاریخ کے آخری مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں' اور یہی وجہ ہے کہ آج کے دور میں "مذہبی" لوگوں کا بھی ان کے مذاہب کے ساتھ رشتہ بے معنی ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مذہب سے بیزاری کے اس دور میں بھی انسان کے اندر مقصد اور معنی کی طلب اور پیاس باقی ہے جسے سائنس کبھی نہیں بجھا سکتی۔ چند ماہ قبل امریکہ میں Heaven's Gates Cult سے تعلق رکھنے والے ۳۹ تعلیم یافتہ افراد کا بعض مذہبی عقائد کی بنیاد پر اجتماعی خودکشی کر لینا اسی روحانی پیاس کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔ چونکہ روایتی مذہب آج کے دور میں اس قابل نہیں رہا کہ انسان کی روحانی پیاس بجھا سکے' نتیجتاً اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اب غیر روایتی قسم کے عجیب و غریب Cults ابھرنے لگے ہیں۔

مولانا عبدالغفار حسن صاحب کا تعزیتی خط

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے نام

مکرمی! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج بخیر ہو گا' عزیزان مع اہم بخیر وعافیت ہوں گے!

کل ۲۷/ مئی کو "ندائے خلافت" مورخہ ۲۸/ مئی موصول ہوا' اس میں محترم حافظ احمد یار صاحب کے انتقال پر ملال کی خبر پڑھ کر انتہائی افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے' جنت میں اعلیٰ مقام سے نوازے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

محترم مرحوم سے پرانے روابط تھے۔ ۵۶-۱۹۵۵ء میں میری رہائش فتحیہ کوارٹرز رحمان پورہ میں تھی' محترم حافظ صاحب بھی میرے قریب ایک کوارٹر میں رہائش پذیر تھے۔ بہت ہی خوش مزاج' بااخلاق' ملنسار اور علمی ذوق سے بھرپور تھے۔ قرآنی رسم الخط اور اعراب سے خاص شغف تھا' جیسا کہ ماہنامہ حکمت قرآن میں شائع شدہ ان کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے۔

قرآن مجید سے گہرے تعلق کی بناء پر انہوں نے اپنے بیٹوں کے نام بھی قرآن سے اخذ کئے تھے۔ ایک بیٹے کا نام "ذوالقرنین" اور دوسرے بیٹے کا نام "نعم العبد" رکھا تھا۔ ان کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ شاید ہی پورا ہو سکے۔ وما ذٰلک علی اللّٰہ بعزیز! ان کے پسماندگان کے ساتھ ساتھ ادارۂ "حکمت قرآن" کے رفقاء بھی تعزیت کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ صبر وجمیل عطا فرمائے۔

محترم مرحوم کی عمر غالباً ۸۰ سال سے متجاوز ہو گی؟ پرانے ساتھی رفتہ رفتہ دار البقاء کو سدھار رہے ہیں۔ اپنی باری بھی قریب ہی معلوم ہوتی ہے۔ "مِنْهُمْ مَنْ قَضٰى

نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا" (سورۂ احزاب) معلوم ہوا ہے کہ مولانا اصلاحی صاحب بھی شدید علیل ہیں۔ اللّٰھم اشفہ!

امِّ صہیب حسن اور والدۂ ذوالقرنین میں بہت زیادہ گہرے روابط تھے۔ ہو سکے تو مرحوم کے عزیزان کو میری طرف سے تعزیتی پیغام پہنچا دیں یا ان کے پتہ سے مطلع کیا جائے۔ غالباً اچھرہ میں سلطان احمد روڈ مکان نمبر ۱۷ میں ان کی رہائش تھی' ان کا اپنا ذاتی مکان ہے۔ آج سے ۱۵ سال قبل ملاقات کے لئے ان کے مکان پر حاضری دی تھی' بہت ہی محبت و اخلاص سے ملے تھے۔ اللّٰھم اغفرلہٗ وارحمہٗ وَارفع درجتہ فی المھدِیّین۔ آمین۔

والسلام

شریک غم

عبدالغفار حسن

پروفیسر حافظ احمد یار مرحوم

ایک علم دوست' درویش صفت انسان

حافظ صاحب مرحوم کے حالات زندگی کے اجمالی خاکے پر مشتمل یہ متاثر کن مضمون مرحوم کی چھوٹی صاحبزادی ڈاکٹر نصرۃ النعیم کا تحریر کردہ ہے جنہیں اپنے والد مرحوم کی رہنمائی میں عربی زبان میں نہ صرف "ایم اے" بلکہ "پی ایچ ڈی" کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

تاریخی شہر جھنگ کے مضافات میں ایک چھوٹے گاؤں کی کچی گلی میں پانچ یا چھ سال کا بچہ کھیل رہا تھا۔ اچانک ایک آدمی ڈھول کی تھاپ پر یہ اعلان کرتا ہوا گزرا کہ اس گاؤں میں پرائمری سکول کا آغاز کیا جا رہا ہے' لہٰذا آپ اپنے بچوں کو پڑھنے کے لئے سکول بھیجیں۔ معصوم بچہ نہ جانے کیا سمجھا کہ بھاگ کر اپنے گھر کے کمرے میں کھڑکی کے پاس جا

کھڑا ہوا۔ بچے کو خوفزدہ دیکھ کر ماں نے بڑے پیار سے پوچھا کہ تم پڑھنے کے لئے جاؤ گے۔ بچے نے ڈرتے ڈرتے آہستگی سے اقرار میں سرہلایا۔ یہاں سے اس بچے کی تعلیم کا آغاز ہوا جو بعد میں علمی و ادبی حلقوں میں پروفیسر حافظ احمد یار کے نام سے معروف ہوئے۔

پروفیسر حافظ احمد یار ۵ فروری ۱۹۲۰ء کو جھنگ سے پانچ میل کے فاصلے پر دریائے چناب کے کنارے واقع گاؤں حبیب (Habib) میں پیدا ہوئے۔ وہیں سے اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔ تعلیم کے حصول میں بہت سے مشکلات پیش آئیں مگر آپ کی والدہ محترمہ کی علم سے بے انتہا محبت کے نتیجہ میں ان مشکلات پر قابو پالیا گیا۔ نہ صرف آپ جامعہ پنجاب میں علوم اسلامیہ کے استاد کے باوقار عہدہ تک پہنچے بلکہ آپ کے دو چھوٹے بھائی بھی گورنمنٹ کالج جھنگ میں انگریزی اور اردو کے پروفیسر کے طور پر فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

ایک دفعہ جب سکول کی فیس ادا کرنے کے لئے غریب ماں کے پاس پیسے نہیں تھے اور ڈر تھا کہ بچے کا نام ہی سکول سے خارج نہ کر دیا جائے تو آپ کی والدہ محترمہ نے اپنی چاندی کی چوڑیاں دیں کہ تم یہ چوڑیاں اپنے استاد کو دے دینا اور کہنا کہ جب فیس کے پیسے ہوں گے ہم پیسے دے کر یہ چوڑیاں واپس لے لیں گے۔ استاد نے ماں کی مجبوری سمجھتے ہوئے چوڑیاں واپس کر دیں اور فیس اپنے پاس سے جمع کروادی۔ پروفیسر حافظ احمد یار نے بعد میں ان چوڑیوں کو ہمیشہ اپنے سینے سے لگا کر رکھا اور اپنے استاد اور اپنی ماں دونوں کے لئے ہمیشہ دعائے خیر کی کہ ان دونوں کے طفیل اس دن میرا تعلیمی سلسلہ منقطع ہونے سے محفوظ رہا۔

پروفیسر حافظ احمد یار کا شمار اپنی کلاس کے لائق طلبہ میں ہوتا تھا۔ آپ نے تعلیم کے ساتھ ساتھ تقریری مقابلوں اور کھیلوں میں بھی بھرپور حصہ لیا اور متعدد انعامات حاصل کئے۔ آپ نے ۱۹۳۵ء میں ایم' بی مڈل سکول جھنگ سے ورنیکلر امتحان پاس کیا اور ۱۹۳۷ء میں ایم' بی ہائی سکول جھنگ سے میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ وہ بے روزگاری کا زمانہ تھا' لہٰذا فوراً ملازمت نہ مل سکی۔ کچھ عرصہ بیکار رہنے کے بعد آپ نے

گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ میں جونیئر سکول ٹیچر کے کورس کے لئے داخلہ لیا۔ وہاں تمام کلاس فیلو مڈل پاس تھے' کورس بھی کوئی مشکل نہ تھا لہٰذا زیادہ تر وقت فارغ رہتے۔ فراغت کے ان اوقات میں آپ نے قرآن پاک حفظ کرنا شروع کر دیا۔ یہ نوجوانی کا وہ دور تھا کہ جب دنیا اپنی تمام تر رنگینیوں سمیت انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہے مگر جب آپ نے دنیا کی طرف توجہ دینے کی بجائے قرآن پاک سے دل لگایا تو اللہ نے آپ کی خاص مدد فرمائی اور آپ نے ۹ ماہ کی قلیل مدت میں قرآن پاک حفظ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اس وقت آپ کی عمر ۲۳ سال تھی۔ قرآن پاک کی برکت سے آپ نے اپنی کلاس میں بھی ٹاپ کیا اور اس بات کی شہرت ہو گئی کہ اس نوجوان نے قرآن پاک بھی حفظ کیا اور اپنے کورس میں بھی اول پوزیشن حاصل کی۔

جونیئر ٹیچرز ٹریننگ کورس کے بعد آپ کو جھنگ کے قریب ہی ایک قصبہ میں سکول ٹیچر کی جاب مل گئی۔ وہاں بھی فراغت کے اوقات میں آپ سکول لائبریری سے مختلف کتابیں لے کر پڑھتے رہتے۔ آپ کے پڑھنے کے شوق کو دیکھتے ہوئے سکول کے ہیڈ ماسٹر نے آپ سے کہنا شروع کیا کہ تم یہ کتابیں پڑھنے کی بجائے ایف۔اے کی تیاری شروع کر دو۔ آپ حامی بھر لیتے مگر زیادہ سیریس نہیں ہوئے۔ اس پر ایک دن جب تمام اساتذہ اکٹھے تھے تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہاتھ اٹھا کر با آواز بلند دعا کی کہ ساتھیو' حافظ احمد یار ایف۔اے کی تیاری شروع کر رہے ہیں' آپ سب دعا کریں کہ اللہ ان کو کامیاب کرے۔ سب نے آمین ثم آمین کہا۔ اس کے بعد آپ نے بھی پکا ارادہ کر لیا اور نہ صرف ایف۔اے کیا بلکہ ۱۹۵۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے کا امتحان بھی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔

آپ کے تعلیمی مراحل میں چونکہ بہت سے نشیب و فراز آتے رہے اس لئے کچھ عرصہ آپ نے محمدی شریف میں مولوی محمد ذاکر صاحب سے عربی کی تعلیم بھی حاصل کی استاد باکمال تھے اور شاگرد بھی ہونہار تھا' سو عربی گرائمر پر کامل عبور حاصل کیا۔

۱۹۵۲ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور میں جب ایم۔اے اسلامیات کی کلاسز شروع ہوئیں تو اخبار میں اشتہار دیکھ کر آپ جھنگ سے لاہور چلے آئے اور ایم۔اے

اسلامیات اول پوزیشن سے پاس کر کے گولڈ میڈل کے حقدار بنے۔ اس کے فوراً بعد آپ اسلامیہ کالج سول لائینز میں اسلامیات کے استاد کی حیثیت سے فرائض سرانجام دینے لگے۔ علم کی کوئی حد نہیں ہوتی اور علم کا پیاسا کبھی سیراب نہیں ہوتا' اسی کے پیش نظر آپ نے ایم۔اے عربی کی کلاسز اٹینڈ کرنا شروع کر دیں۔ اللہ کبھی کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا' سو آپ نے ۱۹۵۷ء میں ایم۔اے عربی میں بھی گولڈ میڈل حاصل کر لیا۔

۱۹۶۴ء میں آپ نے اسلامیہ کالج سول لائینز چھوڑ کر پنجاب یونیورسٹی میں ادارۂ علوم اسلامیہ میں استاد کی حیثیت سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ یہ وہ دور تھا جب کتابیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ آپ کا کتابیں جمع کرنے کا شوق بھی اپنے عروج پر پہنچا اور آپ نے اپنی آمدنی کا زیادہ تر حصہ کتابیں خریدنے پر صرف کیا۔ آپ نے نہ صرف اسلامیات اور عربی سے متعلق کتابیں خریدیں بلکہ تمام سائنسی اور ادبی و تاریخی موضوعات پر کتابیں جمع کیں۔ آپ کو قرآن پاک جمع کرنے کا خاص شوق تھا۔ آپ نے مختلف ممالک کے قرآن پاک کے نادر نسخے حاصل کئے اور قرآن پاک کی کیسیٹس اور ریکارڈز کا بھی ایک ذخیرہ آپ کے پاس موجود تھا۔

پروفیسر حافظ احمد یار صاحب درویش انسان تھے' ساری زندگی شہرت کی پرواہ نہیں کی اپنے کام سے کام رکھا اور متعدد علمی مقالات اور کتب تحریر کیں جن میں "دستور حیاء"۔ "دین وادب" اور "یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ" اہم ہیں۔

پنجاب یونیورسٹی میں استاد کی حیثیت سے آپ نے نہ صرف طلبہ و طالبات کو ایم۔اے کے مقالات میں گائیڈ کیا بلکہ پی۔ایچ۔ڈی کے متعدد مقالات بھی اپنی رہنمائی میں مکمل کروائے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد جناب پروفیسر حافظ احمد یار صاحب قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن' لاہور سے وابستہ ہوئے۔ اس دوران آپ نے نہ صرف عربی گرائمر کی تعلیم دی بلکہ قرآن پاک کی تدریس کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔ یہاں پر یہ بات خصوصی طور پر قابل ذکر ہے کہ آپ نے عہد جوانی میں پیر مبارک علی شاہ صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تھی

اور یہ وعدہ کیا تھا کہ جس حد تک ممکن ہوا میں قرآن پاک کی خدمت کروں گا۔ اسی بیعت کے پیش نظر آپ نے "مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور" میں شرکت کی اور اپنی تمام تر قابلیت سے کام لیتے ہوئے "لغات و اعراب قرآن" کے نام سے ایک کتاب لکھنے کا آغاز کیا۔ یہ یقیناً ایک محنت طلب عظیم علمی و تحقیقی کام تھا مگر آپ نے اپنے تمام دیگر مشاغل سے دامن بچا کر صرف اسی کام کا ارادہ کر لیا تھا۔ اردو زبان میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب تھی جسے مکمل کرنے کی آرزو دل میں لئے آپ راہی ملک عدم ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ سچی بات یہ ہے کہ آپ کے لئے مرحوم کا لفظ استعمال کرنا ہمارے لئے اتنا آسان نہیں ہے مگر پھر راضی برضائے رب رہنا تو مسلمان کا فرض ہے ؎

خالق کون و مکاں' تیری مرضی کے بغیر
زندگانی سے کسی کا رابطہ ٹوٹا بھی ہے!

جناب پروفیسر حافظ احمد یارؒ صاحب کی شخصیت کا ایک پہلو جو عام لوگوں کی نظروں سے کم ہی گزرا اور جس سے ان کا خاص حلقہ احباب ہی واقف ہے' وہ آپ کا علم جغرافیہ سے خاص شغف تھا اور اس شوق کی انتہا یہ ہے کہ آپ کی ذاتی لائبریری میں جغرافیہ سے متعلق خاصی مستند کتابیں موجود ہیں اور آپ عرصہ ۳۰ سال سے دنیا کے مشہور جغرافیائی رسالے National Geographic کے مستقل قاری رہے۔ آپ کا یہ شوق آپ کو ۱۹۷۲ء میں بذریعہ سڑک حج پر بھی لے گیا اور اس طرح آپ نے ایران' عراق اور سعودی عرب کے کافی علاقے کی سیاحت کی۔ اس کے علاوہ آپ نے حرمین شریفین کی زیارت کے دوران سیرت نبویؐ سے متعلقہ مقامات اور علامات کے بارے میں نہ صرف معلومات حاصل کیں بلکہ ان علاقوں کو تلاش کر کے ان کی موجودہ حالت کو بھی ملاحظہ کیا۔

حافظ احمد یار مرحوم و مغفور، بحیثیت استاد

حافظ محمد ابراہیم شیخ

جب ۱۶ مئی ۹۷ء کو اچانک حافظ صاحب کے انتقال کی خبر ملی تو اپنے غم کی کیفیت کے اظہار میں میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ "آج ہم یتیم ہو گئے ہیں" اور واقعتاً میرے احساسات یہی تھے۔ آخر کیوں نہ ہوتے وہ میرے باپ ہی تو تھے۔ وہ میرے استاد تھے اور حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق سب سے افضل والدین اساتذہ ہی ہیں۔ یہ میری انتہائی خوش نصیبی تھی کہ مجھے ان سے فیض اٹھانے کا موقع ملا۔ الحمد للہ کہ میں نے حافظ صاحب سے خوب فیض حاصل کیا اور اس پر بھی اللہ کا شکر ہے کہ جو علم حافظ صاحب سے حاصل کیا تھا اسے اپنی صلاحیتوں کے مطابق آگے پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ (وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم ــــ وجزاہ اللہ عنا احسن الجزاء)

استاذ مکرم ایک جامع الصفات شخصیت کے حامل تھے، دینی علوم کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم کا ایک بیش بہا خزانہ رکھتے تھے۔ انہیں اگر عربی زبان، قرآن کریم، حدیث و فقہ پر خوب دسترس حاصل تھی تو وہ تاریخ اور جغرافیہ کا بھی خوب علم رکھتے تھے جس کا ایک مظہر ان کی بیٹی کا "اماکن السیرہ" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا وہ مقالہ بھی ہے جو حافظ صاحب کی رہنمائی میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ قرآن مجید کے رسم و ضبط کو اردو زبان میں متعارف کرانے کی سعادت بھی ان کے حصے میں آئی ہے۔ ان کی عظیم الشان ذاتی لائبریری میں ہر طرح کی کتابیں موجود ہیں۔ اکثر وہ مختلف کتب حاصل کرنے کی تاریخ بھی بیان کیا کرتے تھے۔ وہاں پر کتابوں کے ساتھ ساتھ دنیا بھر سے جمع کئے گئے قرآن مجید کے طرح طرح کے نادر نسخے اور تلاوت کے کیسٹس بھی موجود ہیں۔

محترم حافظ صاحب کی کچھ باتیں مجھے بہت زیادہ پسند تھیں۔ میں آج خاص طور پر ان کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً ایک تو ان کی کلاس میں کبھی اکتاہٹ طاری نہیں ہوتی تھی۔ ان کی کلاس ان کی محفل کی طرح شرکاء کے لئے دلچسپی کا بھرپور سامان لئے ہوتی تھی۔ وہ ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ دوسرے ان کی ہمیشہ خواہش اور کوشش ہوتی تھی

کہ اپنا maximum علم اپنے طلبہ کو منتقل کردیں۔ وہ اکثر ایسے tips دیتے رہتے تھے کہ سیکھنے والا ان سے بہت کچھ سیکھ جاتا تھا۔ میرے خیال میں استاد کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے علم کے ذخیرے کو ممکنہ حد تک اپنے طلبہ کو منتقل کردے' اور حافظ صاحب اس صلاحیت سے خوب مالا مال تھے۔ تیسرے یہ کہ وہ ایک مضمون پڑھاتے پڑھاتے باتوں باتوں میں بہت سی مزید معلومات دے دیا کرتے تھے۔ جیسے ایک مرتبہ انہوں نے ترجمہ قرآن کے پیریڈ میں ہمیں تاج محل کی سیر کرائی تھی۔ چوتھے یہ کہ باتوں ہی باتوں میں اور چلتے چلتے وہ ایسے جملے کہہ جاتے تھے جو موعظت اور نصیحت سے بھرپور ہوتے تھے' بس شرط یہ تھی کہ آدمی متوجہ ہو۔ پانچویں یہ کہ ان کی اپنے کام سے لگن قابل دید اور قابل رشک تھی۔ جب وہ پڑھانے بیٹھتے تو تین تین پیریڈ زکے گزرنے کا پتہ نہ چلتا' نہ ہی حافظ صاحب کے پڑھانے کی ٹون (Tone) میں کوئی فرق آتا اور نہ ہی حافظ صاحب اپنے بیٹھنے کے انداز کو بدلتے۔ اور جب ہم کہتے کہ سرا وقت ختم ہوگیا ہے بلکہ دس منٹ زیادہ ہوگئے ہیں تو جواب ملتا کہ اچھا! آج تو وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔ اسی طرح اگر وہ کچھ لکھنے بیٹھ جاتے تو بس اذان کی آواز ہی اس میں وقفہ کراتی۔ اکثر ہم دیکھتے کہ زیادہ دیر تک بیٹھنے سے ان کے پاؤں سوج جاتے تھے۔

الغرض صفحے سیاہ ہو جائیں گے لیکن استاد محترم کی خوبیاں اور باتیں ختم نہ ہو پائیں گی۔ مختصراً میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگرچہ میں نے بہت اچھے اچھے اساتذہ سے اکتساب علم کیا ہے لیکن حافظ صاحب ہر لحاظ سے ان میں بہترین استاد تھے اور وہ میرے پسندیدہ ترین استاد تھے اور ان شاء اللہ رہیں گے۔ اگرچہ وہ اس دنیا میں نہیں رہے' لیکن ان کی یادیں تو باقی ہیں' وہ میرا سرمایہ ہیں' ان کا لب و لہجہ میری نگاہوں میں ہے۔ میں جب چاہوں تخیل کی آنکھ سے حافظ صاحب کی کلاس میں پہنچ سکتا ہوں۔

میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے ان کے درجات کو بلند فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں مقام عطا فرمائے' آمین ثم آمین۔ خاص طور پر دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حافظ صاحب کی کتاب "لغات و اعراب قرآن" کی تکمیل کے اسباب غیب سے مہیا فرمائے۔ اس سلسلے میں اگر مجھ ناچیز کو اللہ تعالیٰ کسی درجے میں قبول کرلیں تو میرے لئے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہوگی۔

وقت کے نہایت اہم' انتہائی نازک اور حساس موضوع پر

امیر تنظیم اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد** کی وقیع تالیف

شیعہ سنی مفاہمت

کی ضرورت و اہمیت

شائع ہو گئی ہے۔ جس میں مذکورہ بالا موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحب کے فکر انگیز خطاب کے ساتھ ساتھ درج ذیل موضوعات پر مضامین بھی شامل ہیں :

i) حضرت مہدی موعود کی شخصیت کے بارے میں اہل سنت و اہل تشیع کا موقف (از : ڈاکٹر اسرار احمد)

ii) امیر تنظیم اسلامی کے سفر ایران کے مشاہدات و تاثرات

iii) اسلام میں مختلف مسالک کی حیثیت اور مفاہمت کا راستہ (خطاب : آیت اللہ محمد واعظ زادہ خراسانی)

خود بھی مطالعہ کیجئے اور اپنے حلقہ احباب میں بھی عام کیجئے!

صفحات ۱۳۴' سفید کاغذ' عمدہ طباعت' قیمت ۴۰ روپے

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن فون : 5869501